تعلیم و تربیت

اکتوبر 1998ء

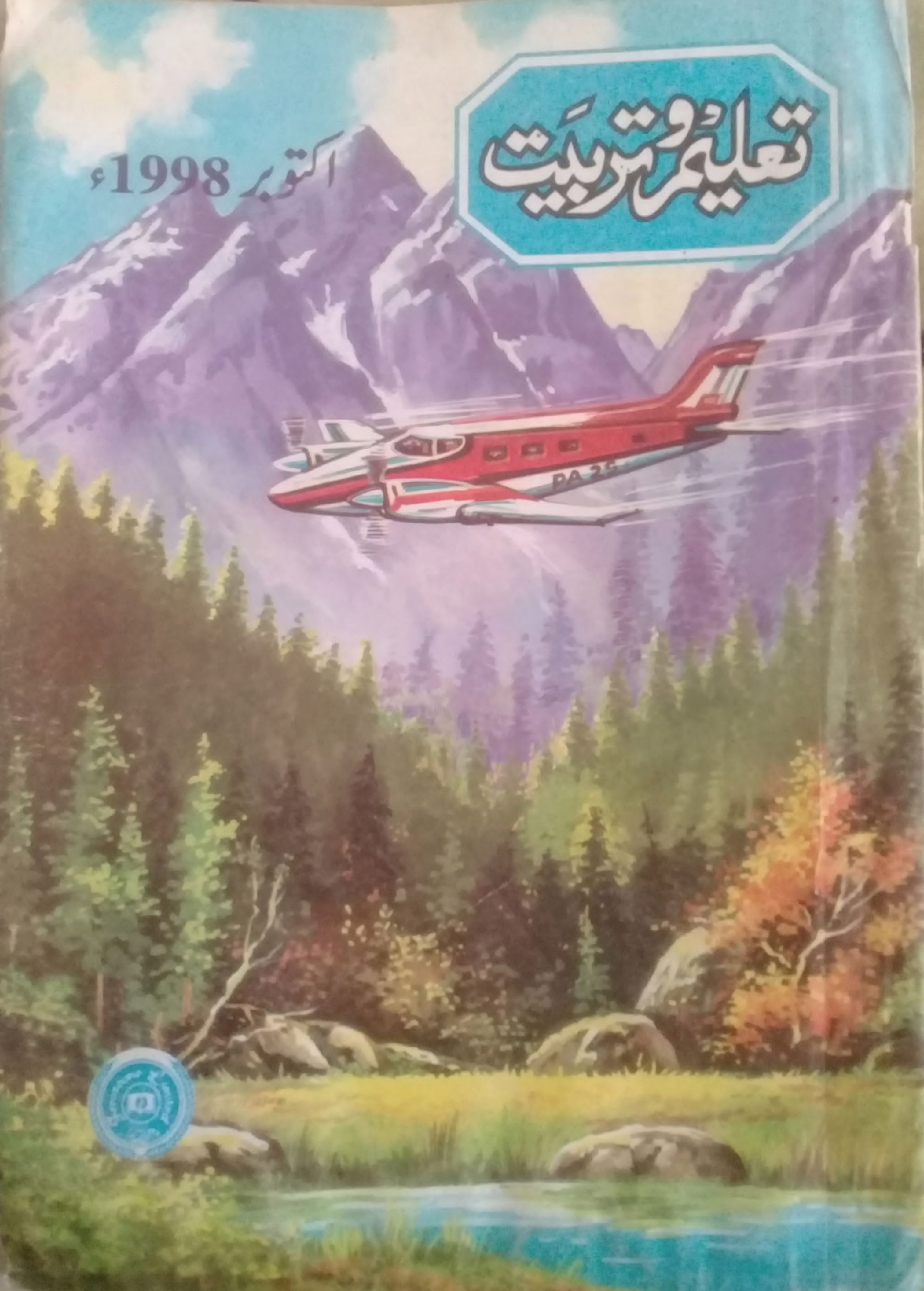

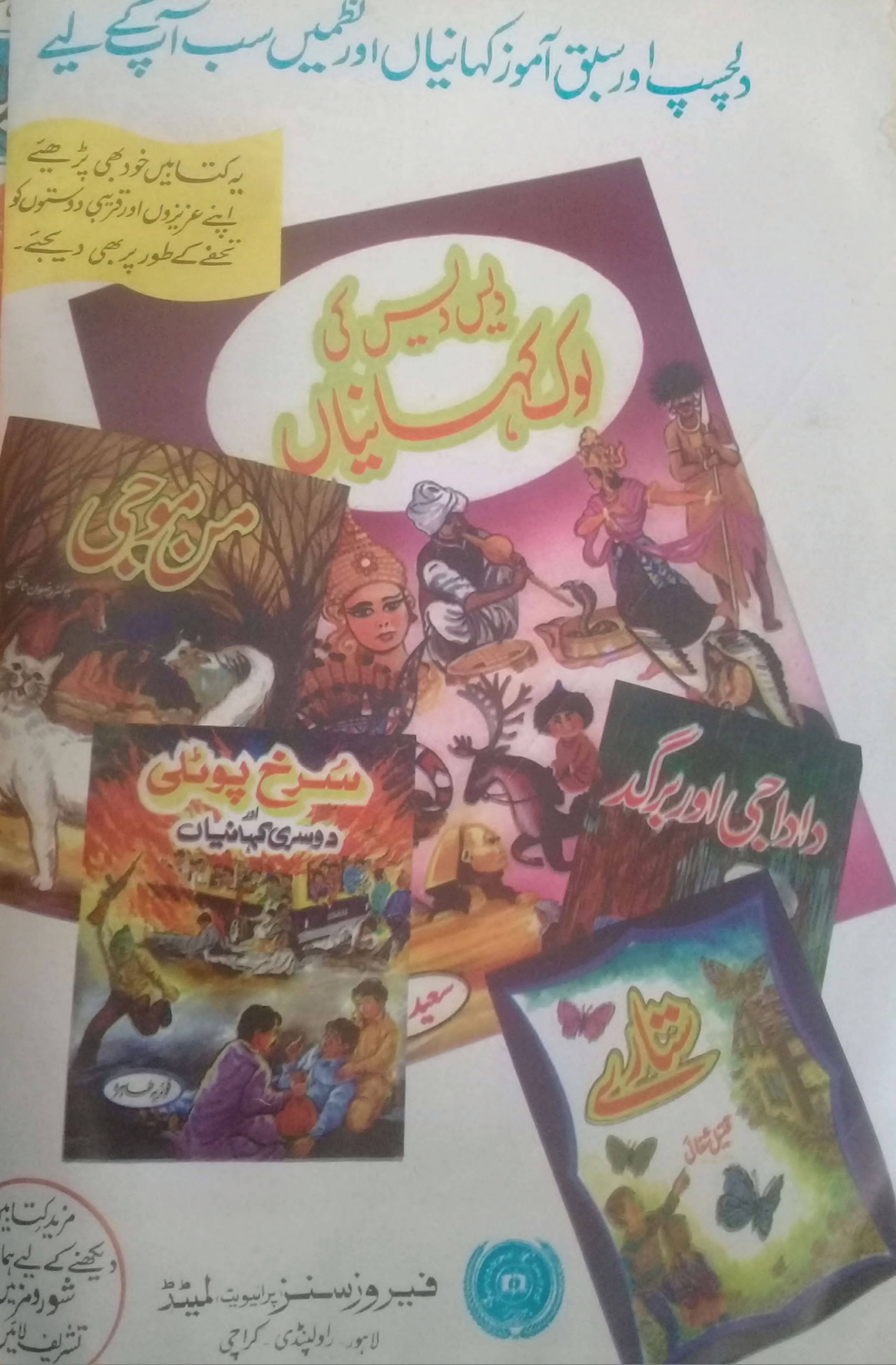

دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں اور نظمیں سب آپ کے لیے
یہ کتابیں خود بھی پڑھیے
اپنے عزیزوں اور قریبی دوستوں کو
تحفے کے طور پر بھی دیجیے۔
دیس دیس کی لوک کہانیاں
من موجی
سرخ پوٹلی اور دوسری کہانیاں
دادا جی اور برگد
ستارے
مزید کتابیں
دیکھنے کے لیے ہما
شورومز میں
تشریف لائیے
فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

بچوں کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

سرکولیشن اسسٹنٹ	السٹریٹرز/ڈیزائننگ	خصوصی مشیر	سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر	ایڈیٹر/پبلشر	چیف ایڈیٹر
محمد بشیر راہی	شوکت اعجاز	محمود حسن رومی	رضوان ثاقب	سعید لخت	ظہیر سلام	عبدالسلام

دوزخ سے فرار

دو بہن بھائی سکینہ اور کریم جو کی مہم جوئی کی لازوال داستان جو قطبی ستارے کو اپنی نظروں کے سامنے رکھتے ہوئے اپنے خوابوں کی جنت میں پہنچ گئے۔ آپ کے پسندیدہ مصنف سلیم خان گمی کی ایک دل چسپ تحریر۔ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

اس مہینے "دل چسپ کھیل 'بغیر خرچ کے" کے عنوان سے تین کھیلوں کی تفصیل شائع کی جارہی ہے۔ امید ہے آپ کو یہ کھیل پسند آئیں گے اور آپ اپنے بہن بھائیوں یا دوستوں کے ساتھ مل کر کھیلیں گے بھی۔ اگر آپ نے اس سلسلے میں دل چسپی ظاہر کی تو پھر ہم آپ کو ہر ماہ ایسے ہی دل چسپ کھیل بتاتے رہیں گے۔

پچھلے دو تین مہینوں سے "آپ بھی لکھیے" میں نقل شدہ تحریریں بھیجنے کا رجحان کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ حالانکہ کسی کی تحریر اپنے نام سے چھپوانے سے اپنی ہی بدنامی ہوتی ہے۔ کیوں کہ جس کسی کو بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریر آپ کی نہیں بلکہ نقل شدہ ہے تو اس کے ذہن میں آپ کے بارے میں بہت بری رائے بن جاتی ہے۔ وہ آپ کو اچھا لکھنے والا سمجھنے کے بجائے نقال اور چور سمجھنے لگتا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جس کی تحریر نقل شدہ ثابت ہوگی، آئندہ اس کی کوئی تحریر تعلیم و تربیت میں شائع نہیں ہوگی۔

بہت سارے بچے ہمیں یہ پوچھتے ہیں کہ تعلیم و تربیت کا سالانہ خریدار بننے کا کیا طریقہ ہے؟ تو جی سنئے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو گھر بیٹھے بٹھائے تعلیم و تربیت ملتا رہے تو آپ سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ پیشگی ارسال کر دیں۔ پورے بارہ مہینے آپ کو تعلیم و تربیت خاص شماروں سمیت بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔ ایڈیٹر

اکتوبر
1998ء

سرورق: خلائی کان

قیمت فی پرچہ =/15 روپے
(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

...یٹ) لمیٹڈ لاہور
...ں: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

اس شمارے میں

فضل ربی راہی 2
نعیم احمد بلوچ 3
اشفاق احمد خان 6
خلائی کان (سائنسی کہانی) شکیل زاہد 19
الزام (کہانی) عظیم اختر یمین 22
دل چسپ اور ناقابل یقین عبدالستار خان طاہر 24
کھا و بامراد! (کہانی) شہناز خان 27
کھیل بغیر خرچ کے محمد عمر سلیم
دل اب بچی میں بچری میکرایں الطاف 34
حفیظ الرحمان احسن 38
ٹھو لسا (کہانی) مجاہد اسماعیل
دل نہیں مانتا (کہانی) سلیم خان گمی 42
ہونہار مصور
آپ بھی لکھیے
قائداعظم کلاسک (بیسویں قسط)
دھوپ چھاؤں (پانچویں قسط) سید نظر زیدی
بلا عنوان کارٹون
باقی سب دل چسپ سلسلے حسب معمول

غصہ

غصہ ہے انسان کا دشمن
غصہ دین ایمان کا دشمن

وہ انسان بڑا کہلائے
غصے پر جو قابو پائے

غصہ اندھا کر دیتا ہے
نفرت دل میں بھر دیتا ہے

اس پر قابو پانا سیکھو!
غصے کو پی جانا سیکھو!

غصے میں تم جب بھی آؤ
فوراً غصے کو پی جاؤ

فضل ربی راہی

انمول انتخاب

نعیم احمد بلوچ

وہ گھڑسواروں کا پورا دستہ تھا۔ گھوڑے دوڑنے کے بجائے دلکی چال چل رہے تھے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی شکار کی تلاش میں ہیں۔ آپس میں افسوس کا اظہار بھی کر رہے تھے کہ آج ان کے ہاتھ کوئی شکار نہیں آیا۔ اچانک ان کے ایک ساتھی نے گھوڑے کی باگ کھینچی اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی رکنے کا اشارہ کیا۔

"کیوں بھئی، رک کیوں گئے؟" ساتھیوں نے پوچھا۔

"وہ دیکھو شکار!"

سب نے ادھر دیکھا جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی خیمہ بستی تھی۔ ایک خیمہ کے باہر ایک چھوٹا بچہ جس کی عمر آٹھ نو سال ہوگی کھڑا تھا۔ ایک کہنے لگا: "بھائیو، یہ بھی خوب رہی ڈاکے سے تو تم ناکام آئے ہو اور اب اس بچے پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ رکھتے ہو!"

توجہ دلانے والا غراتے ہوئے بے رحم لہجے میں بولا: "تمہارے سر کی قسم، یہ بڑا اچھا شکار ہے۔ ایک دو برس کے بعد بڑی اچھی قیمت دے گا!"

"تمہاری ماں خوشی منائے، یہ بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ یہ شکار بڑے کام کا ہے۔ اس کے کسی وارث کے آنے سے پہلے ہی اس کو اچک لیتے ہیں!" کہنے والے نے کہا اور پھر اس نے ساتھیوں کو جھاڑیوں کی اوٹ میں ہونے کے لیے کہا۔ خود وہ اکیلا ہی خیمے کی طرف گھوڑا بڑھانے لگا۔ اس نے بڑی احتیاط سے گھوڑے کو خیمے کے پاس کھڑا کیا۔ نیچے اترا اور کسی چیل کی طرح بچے پر جھپٹا اور اسے ایک ہی ہاتھ سے اٹھا لیا۔ بچے کو گھوڑے کی زین پر بیٹھ کر ایک ہاتھ اس کے اوپر رکھا تاکہ وہ گرنے نہ پائے اور پھر کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر خود بھی بڑی مہارت سے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا گھوڑا ایک ٹٹ بھاگنے لگا۔ اس کے ساتھی خوشی سے نعرے لگاتے اس کے پیچھے ہولیے۔ معصوم بچے کی چیخ پکار، گھوڑے کے ٹاپوں اور غارت گروں کے قہقہوں اور نعروں میں دب گئی۔

خیمے کے اندر بچے کی ماں اور اس کی نانی باتوں میں مصروف تھیں۔ ماں کو پتا ہی نہ چلا کہ بچہ کب کھیلنے کے لیے باہر نکلا۔ وہ تو گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازیں سن کر سہم گئی تھی مگر اسے جب بچے کا خیال آیا اس وقت تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ روتی پیٹتی باہر نکلی تو دیکھنے والے چند ایک لوگوں نے بتایا کہ گزرنے والے ڈاکو تھے اور وہ بچے کو اٹھا کر چلتے بنے ہیں۔

ماں پر تو غشی کے دورے پر دورے پڑنے لگے۔ اغوا ہونے والا بچہ اس کا اکلوتا تھا اور وہ اپنے باپ کا تو بہت ہی پیارا تھا۔ باپ کو بچے کے بغیر چین ہی نہیں آتا تھا۔ وہ تو بڑی ضد کر کے اپنی والدہ کی بستی میں آئی تھی تاکہ اپنے گھر والوں سے مل لے لیکن اسے کیا خبر تھی کہ یہاں یہ الم ناک حادثہ ہو جائے گا۔ بے چاری سوچنے لگی کہ

معلوم نہیں کہ اب بیٹے کا باپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ بے چاری کے آنسو تھے کہ رکنے ہی کو نہیں آرہے تھے۔ آخر باپ شرجیل کو خبر ہوئی اور وہ تو اپنے سر میں خاک ڈالنے لگا۔ اس کے غم کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ مرد ہو کر وہ بیٹے کی جدائی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

شرجیل کو اچھی طرح علم تھا کہ یہ ڈاکو اس کے لخت جگر کو کہیں دور دراز کے علاقے میں بیچ دیں گے اور یوں لاڈ پیار سے پلنے والا ساری زندگی نہ جانے کس حال میں رہے گا۔

باپ نے چاروں طرف گھڑسوار دوڑا دیئے۔ قریب کے تمام علاقوں میں پیغام بھجوائے، منادی کروائی، ماں نے بھی بڑی منتیں مانیں کہ بیٹا مل جائے۔ پورا خاندان اس کام میں جت گیا۔

ڈاکو بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ انہوں نے کس اونچے خاندان کا چشم و چراغ اڑایا ہے۔ اس لیے انہوں نے بچے کو باہر ہی نہ نکالا۔

بچے کی تلاش میں کئی برس گزر گئے بچہ نہ مل سکا۔ مگر شرجیل نے بھی ہار نہ مانی۔ اس کا دل کہتا تھا کہ بیٹا ضرور ملے گا۔

شرجیل ایک دن اپنے گھر میں بیٹے کی یاد میں غمگین بیٹھا تھا کہ اس کے رشتہ داروں میں کچھ لوگ اسے ملنے آئے۔ یہ لوگ اس سال حج کر کے آئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "شرجیل، خوش ہو جاؤ ہم تمہارے بیٹے سے مل کر آئے ہیں!"

"کہاں ہے؟ ہائے میرے دل کا ٹکڑا، مجھے پوری بات سناؤ!" شرجیل اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

رشتہ داروں نے بتایا "اے ہمارے چچا کے بیٹے، ہم اس سال حج کرنے گئے تھے۔ وہاں ہم نے ایک تیرہ چودہ برس کے لڑکے کو دیکھا۔ ہمیں تو وہ تمہارا کھویا ہوا لعل ہی لگا۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ اے شریف باپ کے بیٹے، تم کس قبیلے سے ہو؟ اس نے بتایا کہ بنی کلب سے، ہم نے پوچھا کہ تم یہاں اکیلے کیوں ہو؟ اس نے بتایا کہ کچھ برس قبل مجھے ڈاکوؤں نے اٹھا لیا تھا۔ پھر مجھے مکہ میں رہنے والے ایک قبیلے کے ہاں بیچ دیا۔ اور اب میں ایک شریف اور اونچے خاندان کا غلام ہوں!"

"کیا تم نے اسے اس کے باپ کی حالت نہ بتائی؟ یہ نہ کہا کہ آنسو بہا بہا کر میری آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا ہے؟"

"کیوں نہیں عزیز چچا کے بیٹے" ہم نے تمہارا سارا حال اس سے بیان کیا اور اس نے کہا کہ میرے والد کو تسلی دینا اور کہنا کہ حوصلہ رکھے، غم نہ کرے، میں یہاں پر بہت آرام اور سکون سے ہوں!"

"ہائے میری قسمت! پتا نہیں بے چارہ کس حال میں ہو گا۔ میرا دل بہلانے کو کہہ دیا ہو گا کہ اچھا ہوں.... ارے دوستو! کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ میرا ہی بیٹا تھا؟"

"ہاں ہاں اس معاملے میں تو ہمیں ذرا بھی شک نہیں۔ اس نے اپنا اور تمہارا نام بالکل ٹھیک بتایا تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اسے خیمے کے باہر سے ڈاکوؤں نے اٹھایا تھا!"

شرجیل اپنے بھائی کعب سے کہنے لگا "اے میرے ماں جائے۔ چلو ابھی اور اسی وقت چلو، مجھے تو بیٹے کو دیکھے بغیر ایک پل چین نہیں۔ ہم مکہ کی طرف چلتے ہیں!"

چنانچہ ایک چھوٹا سا قافلہ اسی وقت مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ منزلوں پر منزلیں مارتے یہ لوگ مکہ پہنچ گئے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ بیٹے کو عکاظ نامی میلے میں فروخت کیا گیا تھا اور ان کے خریدار کا نام "حکیم" تھا۔ حکیم ایک معزز قبیلے کا شریف آدمی تھا۔ وہ اس کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس نے شرجیل کے بیٹے کو خریدا ضرور تھا لیکن پھر اسے اپنی ہمشیرہ کو تحفے میں دے دیا تھا۔ شرجیل کو دراصل اسی خاتون کے قبیلے بنی معد کا بتایا گیا تھا۔ اب وہ حکیم کی بہن کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ جس گھر کی طرف جا رہے ہیں وہ بڑے معزز لوگوں کا گھر ہے۔

بتائے گئے پتے پر پہنچے تو ان کی ملاقات ایک نہایت پروقار شخص سے ہوئی۔ شرجیل تو اپنے بیٹے کے آقا کو دیکھتے ہی مطمئن ہو گیا کہ اس شخص کا چہرہ بتاتا ہے کہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے میزبان سے اپنے آنے کا مطلب بیان کیا اور کہا۔

"اے معزز سردار! آپ کا خاندان اللہ کے گھر کا نگہبان ہے۔ آپ مصیبت زدوں کی مدد کرنے اور قیدیوں کو کھانا کھلانے میں شہرت رکھتے ہیں۔ ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ میرا بیٹا آپ کی غلامی میں ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ جس قدر روپیہ پیسہ چاہیں لے لیں مگر میرے بیٹے کو آزاد کر دیں۔ میری آنکھیں

اس کا پیارا چہرہ دیکھنے کو ترس رہی ہیں!"

"معزز مہمان، آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟" میزبان نے انتہائی میٹھے لہجے میں پوچھا۔

"میں حارثہ کے بیٹے زید کی بات کر رہا ہوں!"

"اچھا" میزبان نے کہا اور کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

شرجیل نے میزبان کے چہرے پر تردد دیکھ لیا تھا۔ وہ منزل کے اس قدر قریب آ کر ایک عجیب کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ پھر اس کے کانوں میں آواز آئی "کیا اس کے علاوہ آپ کے یہاں آنے کا کوئی مقصد نہیں؟"

"نہیں مہربان سردار، ہم تو بیٹے کو منہ مانگی قیمت پر لینے آئے ہیں!"

"تو پھر سنئے! زید کو بلوا لیتے ہیں۔ اگر وہ آپ کو پہچان لے اور آپ کے ساتھ جانے کو راضی ہو جائے تو اسے لے جائیے۔ میں اس کے عوض ایک پائی بھی نہ لوں گا۔ لیکن اگر وہ آپ کے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہو تو پھر مجھے پسند نہیں ہو گا کہ آپ اس پر زبردستی کریں!"

اس موقع پر شرجیل اور اس کا بھائی کعب ایک ساتھ بولے "اے شریف زادے! اس سے بڑھ کر اور اچھی بات کیا ہو سکتی ہے! آپ نے تو عین حق اور انصاف کی بات کی ہے!"

زید کو بلایا گیا اور پوچھا گیا: "کیا آپ ان بزرگوں کو پہچانتے ہیں؟"

"کیوں نہیں میرے آقا، یہ میرے پیارے والد ہیں اور یہ محترم چچا!"

"تو زید، تم مجھے بھی پہچانتے ہو۔ میرا خاندان بھی تمہیں معلوم ہے۔ میں نے تم سے جو معاملہ رکھا ہے اس سے بھی تم بخوبی واقف ہو۔ فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے۔ تم پر کوئی زبردستی نہیں۔ تم چاہو تو خوشی کے ساتھ اپنے باپ کے ساتھ جا سکتے ہو۔ چاہو تو یہاں بھی ٹھہر سکتے ہو۔ تم پر کوئی زور نہیں!"

زید کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی، وہ بولے: "آپ محمد ﷺ ہیں۔ اللہ کے سچے آخری رسولؐ ہیں۔ میرے لیے آپؐ سے بڑھ کر کون اہم ہو سکتا ہے۔ خدا کی قسم آپؐ ہی میرے ماں باپ ہیں اور میں ہرگز آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا!"

حضرت زیدؓ کی بات میں ایک جذبہ تھا، محبت کا ایک سمندر تھا۔ باپ اور چچا نے حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ باپ جو نہ جانے کب سے بیٹے کی محبت کا چراغ سینے میں جلائے اسے وادی وادی تلاش کرتا پھر رہا تھا، حیرت اور دکھ سے بیٹے کی طرف دیکھنے لگا اور پھر بول پڑا۔ "اے زید! تم پر افسوس، تم آزادی پر غلامی کو ترجیح دے رہے ہو؟ خدا کی قسم تمہاری تلاش میں کون سا ایسا پتھر ہو گا جو میں نے نہ الٹا ہو گا اور اب تم کیا کہہ رہے ہو؟"

حضرت زیدؓ بولے اے والد محترم، آپ درست فرماتے ہیں لیکن میں نے ان کی ذات میں جو کچھ دیکھا ہے، ان کو جس طرح کا خوب پایا ہے۔ اس کے بعد یہ میرے بس سے باہر ہے کہ میں انہیں چھوڑ دوں" حضرت زیدؓ کا فیصلہ بڑا اٹل تھا۔

باپ اور چچا حیرت سے بیٹے کا فیصلہ سن رہے تھے کہ اللہ کے رسول محمدؐ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے زیدؓ کا بازو پکڑا اور اس کے چچا اور والد کو اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا۔ کعبہ میں پہنچ کر آپؐ نے فرمایا: "میں تم سب لوگوں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ آج سے زیدؓ میرا بیٹا ہے۔ یہ میرا وارث ہے اور میں اس کا وارث"

آپؐ کے اس اعلان سے حضرت زید کے والد اور چچا کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ سوچنے لگے کہ مجھے تو بیٹے کی عزت اور ترقی سے غرض ہے۔ اگر وہ یہاں خوش ہے تو میری خوشی بیٹے کی خوشی کے ساتھ ہے۔ انہوں نے بھی اس فیصلے کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

آپؐ نے انہیں اجازت دی کہ وہ جب چاہیں یہاں آ کر اپنے بیٹے سے مل سکتے ہیں اور زیدؓ کو بھی نصیحت کی کہ وہ اپنے والدین کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے ان کے ہاں جایا کرے۔ یوں حضرت زیدؓ بن حارثہ نے اپنے حقیقی باپ کے بجائے رسول کریمؐ کے ساتھ رہنا پسند کیا اور حضرت زیدؓ غلاموں میں سے سب سے پہلے شخص تھے جو مسلمان ہوئے۔ انہیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حکیم نے عکاظ کے بازار سے خریدا تھا اور تحفے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیا تھا اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے انہیں رسول کریم کی خدمت میں لگا دیا تھا۔ حضرت زیدؓ چند دنوں ہی کے بعد آپؐ کے ساتھ اس قدر مانوس ہو گئے کہ پھر ساری زندگی آپؐ کے پاس رہے۔

اشفاق احمد خاں

شکریہ بچے!

کلیم صاحب جہاز میں سوار ہوئے تو اپنی سیٹ پر ایک ہنستے مسکراتے معصوم چہرے کو پا کر حیران ہو گئے۔ کچھ دیر وہ تذبذب کی حالت میں رہے کہ اسے اٹھائیں یا دوسری سیٹ کا انتظام کریں۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ بچہ سمجھ گیا کہ یہ ان کی سیٹ ہے۔ ”آپ آجائیں“ اس نے دوسری سیٹ کی طرف سرکتے ہوئے کہا۔

”بیٹے اگر آپ کو یہ سیٹ پسند ہے تو آپ ادھر ہی بیٹھ جائیں“ کلیم صاحب پیار بھرے لہجے میں بولے۔

”جی انکل!“ بچہ ان کی طرف میٹھی نظروں سے دیکھتا ہوا ان کی سیٹ پر آگیا۔ کلیم صاحب دوسری سیٹ پر چلے گئے۔ ابھی وہ بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ جہاز کی راہداری میں سے آتے ہوئے دو افراد پر ان کی نظر پڑی۔ ایک آدمی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور دوسرا آدمی اسے پکڑ کر لا رہا تھا۔ وہ سادہ لباس میں کوئی پولیس والا تھا۔ کلیم صاحب کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ان کے سامنے والی نشست پر آبیٹھے۔ بچے نے اچک کر ان کی طرف دیکھا۔ ہتھکڑی والے آدمی نے مڑ کر بچے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

”اب مجرم بھی جہازوں میں سفر کرنے لگے“ کلیم صاحب بڑبڑائے۔

”انکل چیونگم کھائیں گے؟“ بچے نے ببل گم کا پیکٹ ان کے سامنے کیا۔

”ارے نہیں اب یہ کھانے کی عمر نہیں ہے“ کلیم صاحب بولے۔

”انکل اس کا عمر سے کیا تعلق؟ زیادہ عمر کی وجہ سے کھانا بند تو نہیں ہو جاتا“۔ بچے نے کہا۔

”کلیم صاحب نے اس کے ہاتھ سے چیونگم اٹھا لی۔ بچے نے دھیرے سے ایک چیونگم اٹھا کر اگلی سیٹ پر بیٹھے ہتھکڑی لگے مجرم کی گود میں بھی پھینک دی۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا اور بچے کی معصومیت پر مسکرا کر رہ گیا۔

”بیٹے کیا نام ہے تمہارا؟“ کلیم صاحب نے پوچھا۔

”اسد علی' گڈو بھی کہتے ہیں مجھے“ اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

”اسد بیٹے، تم نے اس مجرم کو چیونگم کیوں دی“؟

”انکل وہ! آدمی بھی تو ہے“ اس نے بڑے سادہ انداز میں کہا تو کلیم صاحب لاجواب ہو گئے۔

”ہاں.... ہاں آدمی تو ہے“۔

اتنی دیر میں اس مجرم نے پھر سے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ اسد نے اپنے بیگ میں سے برگر نکال کر اسے تھما دیا۔ اس نے شکریہ کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور ندیدوں کی طرح کھانے لگا۔ اس کے ساتھ بیٹھے پولیس والے نے مڑ کر اسد کو گھورا لیکن وہ قطعاً متاثر نہ ہوا اور ایک جوس کا پیکٹ بھی اسے دے دیا۔ کلیم صاحب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد مجرم کے ساتھ بیٹھے پولیس والے نے اس کی ہتھکڑی اپنی کلائی سے اتار کر سیٹ کے ساتھ باندھ دی اور خود اٹھ کر پائلٹ کی سیٹ کی طرف چلا گیا۔

اسد نے موقع غنیمت جانا۔ جھٹ سے کلیم صاحب کے آگے سے گزر کر مجرم کے ساتھ جا بیٹھا۔ اس مجرم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسد مسکرا دیا ”آپ حیران کیوں ہوئے ہیں؟“

”ہاں بچے، میں تم پہ حیران ہوں، لوگ مجرموں سے ڈرتے ہیں اور تم نے مجھے برگر کھلایا، جوس پلایا اور اب یہاں میرے ساتھ آبیٹھے ہو“۔

”اصل میں میں تھوڑا سا شرارتی بھی ہوں اور بہت پیارا بھی“۔

”ہیں... یہ کیا کہا؟“ اس نے انوکھے انداز میں آنکھیں پٹ پٹائیں۔

”تو کیا نہیں لگتا؟“ اسد نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

”بھئی پیارے تو بہت ہو‘ شرارتی البتہ کم لگتے ہو۔ لیکن سوال تو وہی ہے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”اس کی ایک وجہ ہے“ اسد نے اداسی سے کہا۔ ”لوگ کہتے ہیں بلکہ شکایت کرتے ہیں کہ میں اپنی عمر سے بڑا بنتا ہوں بھلا آپ ہی بتائیے میں آپ کو اگر آدمی پہلے اور مجرم بعد میں سمجھوں تو آپ میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟“

”بہت اچھا سوچوں اور سمجھوں گا بچے! لیکن یہ بتاؤ تم مجھے یہ آدمی پہلے اور مجرم بعد میں کیوں ٹھہرا رہے ہو؟ تمہیں اس بات کی کیا سمجھ؟“

”انکل‘ بات یہ ہے کہ مجھے اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ انہی کتابوں نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ کوئی شخص جب پیدا ہوتا ہے تو وہ بڑا پاکیزہ اور نیک ہوتا ہے۔ برا تو وہ بعد میں بنتا ہے۔ اس کا گھر‘ اس کے رشتے دار‘ گلی محلے والے اور جسے ہم سب معاشرہ کہتے ہیں وہ مل کر اس شخص کو مجرم بناتے ہیں“۔

”بچے!“ اس آدمی نے حیران ہو کر اس کو دیکھا! ”تم تو بہت ذہین ہو‘ بہت اچھے اور نیک‘ جتنے باہر سے خوب صورت ہو تمہارا دل بھی اتنا ہی خوب صورت ہے۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ ماں باپ جنہوں نے تمہاری اچھی تربیت کی“

”تو کیا آپ کے امی ابو نے آپ کی اچھی تربیت نہیں کی؟“ اسد نے پوچھا۔

”اس میں ان کا کوئی قصور نہیں‘ یہ سب میرے برے دوستوں کا قصور ہے۔ انہوں نے مجھے غلط راستے پر لگا دیا“ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”اسی لیے تو کہتے ہیں کہ بروں سے دوستی انسان کو بگاڑ دیتی ہے“ اسد نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں‘ ٹھیک کہا تم نے۔ اچھا یہ بتاؤ‘ تم رہتے کہاں ہو؟“ اس نے اسد کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

”اسد اس کا مفہوم سمجھتے ہوئے اسی طرح سرگوشی میں بولا ”ماڈل ٹاؤن میں ہماری رہائش ہے“۔

”اچھا.... ماڈل ٹاؤن“ اس کے چہرے کی چمک کچھ ماند پڑی۔

”انکل آپ کو یہ لاہور کیوں لے جا رہے ہیں“۔

”بچے‘ میں نے لاہور میں ڈاکہ ڈالا تھا‘ اس لیے مجھے اب لاہور ہی میں سزا کاٹنا پڑے گی“۔

”لیکن یہ آپ کو جہاز پر کیوں لائے؟ مجرم تو میرا خیال ہے جہازوں کے ذریعے نہیں لے جائے جاتے‘ وہ تو جالی دار بند گاڑیوں میں لائے جاتے ہیں“ اسد نے کہا۔

”ہاں درست کہا تم نے‘ مجھے اصل میں دل کی تکلیف ہے۔ پرسوں مجھے دل کا دورہ پڑا تھا۔ آج مجھے لاہور پہنچانا ضروری تھا۔ اس لیے مجھے جہاز پر لے جایا جا رہا ہے“۔

اسد یہ سن کر چند لمحے خاموش رہا۔ اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کہے۔ اچانک اس آدمی نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا ”بچے‘ تم مجھے بہت اچھے لگے ہو‘ تم نے مجھے یہ احساس دلایا ہے کہ میں مجرم ہی نہیں ایک انسان بھی ہوں‘ مجھے یقین ہے کہ تم میری مدد کر سکتے ہو“۔

”مدد؟ کیسی مدد؟“ اسد نے پوچھا۔

”یقیناً مجھے آٹھ دس سال جیل میں گزارنا پڑیں گے۔ میرے بیوی بچے بھی ہیں اور وہ میرے بغیر بہت برے حالات کا شکار ہو جائیں گے۔ اگر انہیں لوٹی ہوئی رقم مل جائے تو وہ زندگی سکون سے گزار سکیں گے“ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”تو میں کیا کر سکتا ہوں؟“ اسد نے حیران سے لہجے میں دریافت کیا۔

”تم وہ رقم میرے گھر والوں کو پہنچا کر میرے اوپر ایک احسان کر سکتے ہو“ وہ شخص بولا۔

”میں.... مگر میں کیسے؟“ اسد الجھ سا گیا۔

”ہاں بچے‘ مجھے یقین ہے کہ تم جیسا پیارا اور صاف دل لڑکا مجھے دھوکا نہیں دے سکتا“ اس آدمی نے بدستور دھیمے لہجے میں کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن....“

”دیکھو بچے‘ میرے بھی تمہارے جیسے چار معصوم بچے ہیں‘ وہ بھوکے مریں گے۔ اگر میں ان تک پیسے نہ پہنچا سکا تو....“ اس

شخص نے مزید کچھ کہنا چاہا۔
"ٹھیک ہے، لیکن اس کے لیے آپ کو میری ایک بات ماننا ہو گی" اسد نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
"بولو بچے، کیا بات ہے وہ؟"
"آپ وعدہ کریں کہ آئندہ سے برے کام چھوڑ دیں گے"۔
"یہ تو میں پہلے ہی طے کر چکا ہوں کہ آئندہ ہر برا کام چھوڑ دوں گا۔ اس کے لیے تمہیں مجھ سے وعدہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد تم مجھ سے یہ تقاضا نہ کرنا کہ میں لوٹی ہوئی رقم واپس کر دوں۔ یہ تو میں نے پولیس کو ہزار جتنوں کے بعد بھی نہیں بتایا کہ رقم کہاں ہے؟ اور ویسے بھی اس رقم سے میرا مستقبل وابستہ ہے" اس آدمی نے ذرا سخت مگر سرگوشی ہی کے لہجے میں کہا۔
"ہوں.... اچھا ٹھیک ہے، آپ بتائیں آپ کا گھر اور رقم کہاں ہے؟" اسد نے بھی سرگوشی سے پوچھا۔
"پھر اس آدمی نے اس کو اپنے گھر کا مکمل پتا سمجھایا تو اسد حیران رہ گیا۔ اس کا گھر ملتان روڈ کی جس آبادی میں تھا وہاں اس کے چچا جان کا گھر تھا اور سب سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ رقم وہیں ایک قریبی مکان کے لان میں دفن تھی اور یہ مکان اسی مجرم کی ملکیت تھا۔ اسد نے سرگوشیوں میں ساری بات سمجھی اور آخر میں اس کا نام پوچھ کر اپنی سیٹ پر چلا گیا۔ اس کا نام نذیر تھا۔ تقریباً 15 منٹ کے بعد پولیس والا اپنی سیٹ پر پہنچ چکا تھا۔

اس مجرم نذیر نے کہنے کو تو اسد کو کہہ دیا تھا مگر اب وہ دل میں خوف زدہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ دھوکا دے جائے یا کسی بڑے کو بتا دے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پیسے نکالتے ہوئے پکڑا جائے۔ اس طرح کے کئی وسوسے اسے پریشان کر رہے تھے۔ لیکن اب تو کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے دن رات اسی خوف کے ساتھ سفر کرتے رہے۔

وقت کا پہیا گردش کرتا رہا اور اس کی سزا کے ساڑھے چھ سال بیت گئے۔ اس کے اچھے چال چلن اور شریفانہ رویے کی وجہ سے باقی سزا معاف کر کے اسے رہا کر دیا گیا۔ وہ جیل سے باہر نکلا تو کسی کو بھی اس کی رہائی کے بارے میں علم نہ تھا۔ اپنے بیوی بچوں کو تو اس نے خبر ہی نہ دی تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟ لیکن اسے امید تھی کہ اس کے بیوی بچے اچھے حال میں ہوں گے۔ کیوں کہ اسد نے ہر صورت میں اپنا وعدہ نبھایا ہو گا۔

دو ویگنیں بدل کر وہ اپنے گھر پہنچا۔ ان کے علاقے میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ مگر اسے یقین تھا کہ ان کے گھر میں ضرور تبدیلی آئی ہو گی۔ لیکن اس وقت وہ شدید حیرت اور صدمے کا شکار ہو گیا جب اس نے اپنے گھر کو اسی پرانی کھنڈر نما حالت میں دیکھا۔ وہ کتنی ہی دیر گومگو کی کیفیت میں رہا۔ پھر آخر کار گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کے بیوی بچے اسے یوں اچانک اپنے درمیان پا کر حیران ہوئے اور پھر ان کے آنگن میں خوشیاں ہی خوشیاں بکھر گئیں۔

نذیر کو اپنے گھر میں کسی خاص تبدیلی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اسد نامی اس بچے نے اس کو دھوکا دیا تھا۔ پھر بھی موقع پاتے ہی اس نے اپنی بیوی سے رقم کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا "آپ نے جو پانچ لاکھ بھیجے تھے وہ تو میں نے بنک میں جمع کروا دیئے تھے۔ ہر مہینے ان سے ملنے والا منافع اتنا تو ہوتا ہے کہ ہم اچھے طریقے سے گزر بسر کر رہے ہیں"۔

"پانچ لاکھ؟" نذیر نے حیران ہو کر پوچھا۔ شاید اسے پچاس لاکھ سننے کی توقع تھی۔ "ہاں، آپ نے بڑا اچھا کیا جو اتنی رقم ہمارے لیے بھیج دی تھی"۔

لیکن نذیر اس کی بات سننے سے پہلے ہی گھر سے باہر جا چکا تھا۔ اس کا رخ اسد کے گھر کی طرف تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس نے اسد سے اس کے گھر کا پتا سمجھ لیا تھا۔ ماڈل ٹاؤن پہنچ کر اس نے مطلوبہ کوٹھی کی گھنٹی بجائی۔ ایک ملازم گیٹ پر آیا۔ اس نے اسد کے متعلق پوچھا۔ ملازم نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکا اندر داخل ہوا۔ یقیناً یہ اسد تھا۔ چھ، ساڑھے چھ سالوں میں بہت بدل گیا تھا۔ لیکن وہ تو اس کی پہچان کو آنکھوں میں بسائے ہوئے تھا۔ اسے پہچانتے ہی اس نے جیب سے خنجر نکال کر اس کی گردن سے لگا دیا۔ اسد ایک لمحے کے لیے تو خوف زدہ ہو گیا تھا مگر پھر وہ نذیر کو پہچان گیا۔

"تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا لڑکے!" اس نے غرا کر کہا۔ میں نے تم پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا لیکن اتنا پیسا دیکھ کر تم بھی ڈگمگا گئے"۔

"نہیں، میں نہیں ڈگمگایا" اسد نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"پچاس لاکھ میں سے صرف پانچ لاکھ میرے بچوں کو دیئے اور کہتے ہو تم نے کچھ نہیں کیا" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"اس نے ٹھیک کہا نذیر علی، اس کو چھوڑ دو" ڈرائنگ روم کے دروازے سے ایک ادھیڑ عمر آدمی نے اندر آتے ہوئے کہا۔

نذیر نے پہلے حیرت سے اس طرف دیکھا اور پھر خنجر پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا "ہرگز نہیں، یہ میرا مجرم ہے"۔

"سنو نذیر علی، اسد تمہارا مجرم نہیں، تمہارا مجرم میں ہوں۔ میں اسد کا والد ہوں"۔

"تو آپ دے دیجئے رقم، مجھے تو رقم چاہیے"۔

"نذیر علی، بات اصل یہ ہے کہ تم نے برائی سے توبہ کر لی تھی، اس لیے ہم نے تمہاری مدد کا فیصلہ کر لیا تھا"۔

"بہت اچھی طرح مدد کی میری، میرا ہی پیسا ہضم کر گئے" نذیر تن تنا کر بولا۔

"تم غصے میں ہو، تمہیں سوائے اپنے پیسے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن اتنا سن لو، تم اسد کے ساتھ جو سلوک مرضی کرو۔ کوئی بھی فرض شناس شہری اس رقم کو یوں آنکھیں بند کر کے تمہارے گھر والوں کو نہیں دے سکتا تھا۔ کیوں کہ یہ رقم بنک کی ملکیت تھی۔ اسد نے مجھے بتایا تو میں نے بنک والوں کو اس رقم کی خبر دے دی۔ انھوں نے پولیس کی مدد سے وہ رقم برآمد کر کے اسد کو پانچ لاکھ روپے انعام دے دیئے اور یہ پانچ لاکھ وہی تھے جو ہم نے تمہارے گھر والوں کو بھجوائے۔ تم انھیں حرام کا روپیہ دینا چاہتے تھے۔ ہم نے انھیں حلال کا پیسا پہنچا دیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تم نے اسد کے سامنے توبہ کا اعتراف کیا تھا اور توبہ تو ہمارا رب بھی قبول کر لیتا ہے، ہم انسان کیا چیز ہیں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ غلط ہم نے کیا یا تم غلط کر رہے ہو" اسد کے والد نے دلائل کے ساتھ پوری بات اس کے سامنے رکھ دی۔

نذیر علی کچھ دیر کشمکش میں رہا پھر اس نے خنجر ہاتھ سے پھینک دیا اور اسد کا بازو تھام کر بولا "شکریہ بچے... تم نے اچھا کام کیا اور اپنی فطرت کے عین مطابق کیا۔ اگر تم یہ نہ کرتے تو مجھے یقیناً کبھی نہ کبھی اس کا افسوس ہوتا۔ اب مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ میں نے جب تمہیں نیک اور بہت خوبصورت دل کا مالک کہا تھا، اس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہ آسکی کہ نیکی کا تقاضا تو اس کے بالکل الٹ ہے جو کچھ میں نے تمہیں کرنے کو کہا ہے"۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ اس بات کو کچھ سمجھ گئے"۔ اسد نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کا یہ مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اتنی بڑی رقم آپ نے میرے گھر والوں کو دے دی۔ میں اس رقم سے کوئی کاروبار کر کے جلد ہی آپ کو لوٹانے کی کوشش کروں گا"۔

"ہم تمہارے کاروبار میں برکت کے لیے دعاگو ہیں" اسد کے والد نے کہا اور نذیر علی ان سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

درس قرآن

مایوس نہ ہوں!

عوام اور حکومت کی بعض غلط روشوں کی وجہ سے ملک میں مایوسی اور ناامیدی کے کالے بادل چھائے چلے جارہے ہیں۔ حالات کے اس تشویش ناک پہلو کی مناسبت سے ہم نے بچوں کے آج کے درس قرآن کا موضوع "مایوس نہ ہوں!" منتخب کیا ہے۔ اسلام میں مایوسی کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بات چوبیسویں پارہ کی سورۃ نمبر39 کی آیت نمبر53 کے ان دو الفاظ سے واضح ہے:

وَلَا تَقْنَطُوْا

ترجمہ: مایوس نہ ہو!

روزمرہ زندگی میں کئی بار ایسے بھی ہوتا ہے کہ انسان یوں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کی الجھنوں اور مصیبتوں کا کوئی حل ہی نہیں۔ بچوں کی زندگی میں ایسی کیفیت عموماً اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہزار کوششوں کے باوجود انہیں لکھائی پڑھائی یا کسی اور معاملے کی مشکل باتیں پلے نہ پڑیں' جب صحت بگڑتی دکھائی دے' جب لاکھ جتنوں کے باوجود مقصد و مدعا حاصل نہ ہو' جب بچے کو یوں محسوس ہو کہ وہ دن بدن نیچے گرتا چلا جارہا ہے' اسے مدد اور رہنمائی کی اشد ضرورت ہو مگر اس کی کوئی موثر صورت دکھائی نہ دیتی ہو' وغیرہ وغیرہ۔

ایسے میں زندگی ناامیدی' یاس' افسردگی اور پریشانی کے شکنجوں میں بری طرح جکڑتی دکھائی دیتی ہے۔ ہر جانب تاریکی اور ناکامی کا غلبہ نظر آنے لگتا ہے۔ قہقہوں' امیدوں' عزموں اور ولولوں کی چاشنی روزمرہ زندگی کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہے۔ بسا اوقات یہ کیفیت اذیت وہ افسردگی کے علاوہ کئی دوسری جسمانی اور ذہنی بیماریوں کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتی ہے۔

اگر کہیں آپ بھی ایسی کیفیات کے نرغے میں آجائیں تو آپ کو فوراً امی' ابو' ماسٹر جی' مسجد کے امام یا کسی اور مشفق دانا سے مشورہ کرنا چاہیے اور ان کی بتائی ہوئی اچھی اچھی باتوں پر عمل کرنا چاہیے۔ ان شاء اللہ آپ مایوسی کے پھندوں سے نجات حاصل کرنے میں کام یاب ہو جائیں گے۔

مایوسی سے محفوظ رہنے کے بہترین طریقے باجماعت نماز اور منظّم کھیل تفریح ہیں۔ اللہ کے گھر حاضری دینے اور مختلف لوگوں سے مل جل کر عبادت کرنے سے ذہن اور جسم پر بہت خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح کھیل تفریح سے نہ صرف جی بہلتا ہے بلکہ آس اور امید کی کرنیں پھوٹتی ہیں' شعور میں نکھار آتا ہے۔ چھوٹے موٹے معاشرتی مشاغل اور فلاحی کاموں میں شرکت سے بھی بہت مدد ملتی ہے۔ ایسے اور اسی قسم کے دوسرے تعمیری مشغلوں میں مصروفیت سے مایوسی اور افسردگی پر ضرب کاری لگتی ہے اور انسان ایک بار پھر بندہ مومن کی طرح تازہ دم ہو کر زندگی کے مختلف مورچوں پر ڈٹ جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالر

انوکھا محسن

نجمہ معراج

عبدالرزاق کا والد خوشی محمد خشک میوہ جات یعنی اخروٹ، بادام، پستہ، کٹی ہوئی گری، بھنے ہوئے چنے اور کش مش وغیرہ کا ٹھیلہ لگاتا تھا۔ وہ پانچویں تک پڑھ سکا تھا۔ خوشی محمد چاہتا تھا کہ اب اس کا بیٹا زیادہ پڑھے اور کوئی اچھی سی ملازمت کرے تاکہ اسے یہ محنت مزدوری نہ کرنا پڑے اور سارا دن دھوپ میں کھڑے ہو کر چیزیں بیچنے کے بجائے کسی دفتر میں پنکھوں کے نیچے بیٹھ کر لکھائی پڑھائی کا کام کیا کرے۔ اسی لیے وہ رزاق کو ہر صبح خود اسکول چھوڑ کے آتا۔ وقت گزرتا رہا۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے رزاق آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ اس کی ایک چھوٹی بہن چھٹی جماعت میں تھی اور ایک سب سے چھوٹا بھائی چار سال کا تھا۔ جو ابھی اسکول نہیں جاتا تھا۔

خوشی محمد اپنے بچوں کے لیے ان کی عمر کے مطابق چیزیں لاتا۔ چھوٹے کے لیے کھلونے اور بڑی بیٹی اور بیٹے کے لیے بھی لڈو تو کبھی کوئی دوسری گیم پہیلے پہل بیٹی کے لیے گڑیا بھی لاتا تھا۔ ایک دن، جب خوشی محمد ٹھیلہ لے کر گھر جا رہا تھا تو اس کے ذہن میں آیا کہ آج کافی آمدنی ہو گئی ہے، بچوں کے لیے کوئی چیز لے جائے۔ انہیں سوچوں میں گم وہ ٹھیلے کو دھکیل رہا تھا کہ اس کی نظر ایک بہت بڑے بک اسٹال پر پڑی۔ اس نے ٹھیلا ایک طرف کھڑا کیا اور بک اسٹال کے اندر چلا گیا۔ اب وہ دیوار پر لگے بچوں کے رسالوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ رزاق اور ثمینہ کے لیے کون سا رسالہ خریدے جو ان کے تعلیمی معیار کے مطابق بھی ہو اور اصلاحی بھی۔ وہ وہاں کھڑا مختلف رسالوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک اور آدمی نے جو اپنے لباس سے کوئی پڑھا لکھا محسوس ہوتا تھا، چشمہ اپنی جیب سے نکال کر آنکھوں پر لگایا اور بریف کیس ایک طرف رکھ کر مختلف رسالوں کو پکڑ پکڑ کر دیکھنے لگا۔ خوشی محمد نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور بولا "بھائی صاحب، میرا بھی ایک مسئلہ حل کر دیں"

وہ آدمی جلدی سے بولا "بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟"

خوشی محمد بولا "میرا ایک بچہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے اور دوسری بچی چھٹی میں، میں کوئی ایسا رسالہ خریدنا چاہتا ہوں جو ان دونوں کے لیے دل چسپ بھی ہو اور مفید بھی"۔

ان صاحب نے یہ بات سن کر جلدی سے بک اسٹال سے ایک رسالہ پکڑا اور خوشی محمد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

خوشی محمد رسالے کا نام "تعلیم و تربیت" دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دکان دار کو 15 روپے دے کر رسالہ لیا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ نام سے وہ سوچنے لگا "تعلیم اور تربیت نام تو اچھا ہے۔ یقیناً یہ رسالہ اندر سے بھی اچھا ہی ہو گا"۔

جب وہ گھر پہنچا تو حسب معمول اس کی بیٹی ثمینہ کھانا لے کر آئی اور ساتھ ہی عبدالرزاق بھی سلام کہتا ہوا ابو کے پاس آکے کھڑا ہو گیا۔ خوشی محمد نے کہا "بیٹا' میرے ٹھیلے کے آگے ایک رسالہ پڑا ہوا ہے' وہ لے لو اور دونوں بہن بھائی مل کے پڑھ لینا۔ رزاق خوشی سے دوڑتا ہوا گیا اور رسالہ لے کر اپنی چارپائی پر جا بیٹھا۔ وہ اس میں سے کہانیاں اور نظمیں پڑھ کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ پھر جب ثمینہ نے پڑھا تو اس کو بھی یہ رسالہ بہت پسند آیا۔ رنگ دار تصویریں بھی ثمینہ کو بہت بھلی لگتیں۔ بچوں نے اپنے والد کو یہ فرمائش کی کہ ہمیں بے شک اور کوئی چیز نہ لا کر دیا کریں مگر یہ رسالہ ہر ماہ لا دیا کریں۔ اب رزاق کا والد ہر ماہ یہ رسالہ لے آتا وہ دونوں بہن بھائی بہت شوق سے پڑھتے۔ انہوں نے رسالے میں قلمی دوستی کے بارے میں پڑھا۔ ثمینہ نے بھائی سے کہا "بھائی آپ بھی کسی سے قلمی دوستی کر لو"

"ٹھیک ہے" اس نے بہن کی بات کو پسند کرتے ہوئے آنکھیں گھمائیں۔ اس نے رسالہ پکڑا اور قلمی دوستی کے کالم سے مختلف بچوں کے نام پتے اور مشغلے پڑھنے شروع کر دیئے۔ اس میں ایک لڑکے نے اپنا نام نبیل اور مشغلہ غریبوں کی مدد کرنا لکھا تھا۔ یہ مشغلہ اور نام دونوں ہی رزاق کو بہت پسند آئے۔ رزاق کی امی کے پاس لفافے ہوتے ہی تھے۔ کیوں کہ وہ اپنے بھائی کو گاہے بہ گاہے خط لکھتی رہتی تھیں۔

امی اس وقت باورچی خانے میں کام کر رہی تھیں۔ رزاق ان کے پاس گیا اور بولا "امی جان' مجھے ایک لفافہ تو دیجئے۔ میں نے ایک لڑکے سے قلمی دوستی کرنی ہے"۔

اس کی امی یہ سن کر خوش ہوئیں اور الماری سے ایک لفافہ نکال کر رزاق کو دے دیا۔ اس نے نبیل کے نام خط لکھ کر پوسٹ کر دیا۔ ابھی خط پوسٹ کیے دس دن ہی گزرے تھے کہ ڈاکیے نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ اور نیلے رنگ کا ایک لفافہ رزاق کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ خط کے باہر نبیل کا نام دیکھ کر بہت خوش ہوا خط میں نبیل نے رزاق کو دوست لکھنے کے بجائے بھائی لکھ کر مخاطب کیا تھا۔ نبیل نے اپنے والد کے متعلق لکھا تھا کہ وہ مل مالک ہیں اور اس نے یہ بھی لکھا کہ وہ تین بھائی ہیں' ایک نبیل سے بڑا اور ایک چھوٹا۔ وہ یہ سب کچھ پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ اب دونوں میں خط و کتابت کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ اپنے خطوں میں ایک دوسرے کو اپنے ہاں آنے کے لیے کہتے۔ دونوں کے شہروں کا فاصلہ بھی بہت تھا۔ نبیل کراچی میں تھا اور رزاق لاہور میں رہتا تھا۔ رزاق اگر جانا چاہتا بھی تو اس کے پاس تو کرائے کے لیے پیسے نہ تھے۔ البتہ آہستہ آہستہ دونوں کے دل میں ایک دوسرے سے ملاقات کی خواہش شدت پکڑ رہی تھی۔

اس دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں نبیل کے رزاق کے نام یکے بعد دیگرے تین چار خط آئے جن میں اس نے اپنی بیماری کا ذکر کیا تھا۔ ایک خط میں اس نے لکھا "رزاق بھائی' پرسوں میرے پیٹ میں شدید درد ہوا اور ابو مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے دوائی دینے کے بعد کچھ ٹسٹ لکھ دیئے۔ ابو جان جب ان ٹسٹوں کی رپورٹ ڈاکٹر کو دکھا کر آئے تو اس میں لکھا تھا کہ اپنڈکس کا اپریشن فوراً ہونا چاہیے۔ ابو نے اپریشن کے لیے لاہور کے ایک پرائیویٹ ہسپتال کو منتخب کیا ہے۔ ابو کا خیال ہے کہ وہ اچھا ہسپتال ہے اور ابو کی وہاں واقفیت بھی ہے۔ اس لیے میں اپریشن کے لیے کل لاہور آرہا ہوں۔ اگر آپ یہ ہسپتال ڈھونڈ سکیں تو میری عیادت کے لیے ضرور آئیں"۔

نبیل نے ہسپتال کا جو نام لکھا تھا رزاق وہ پڑھتے ہی خوشی سے اچھل پڑا کہ میرا دوست تو میرے گھر کے پاس ہی آرہا ہے۔ میں ضرور اس سے ملنے جاؤں گا۔ کیوں کہ رزاق

کا گھر اس ہسپتال کے پیچھے جو خالی جگہ تھی وہاں پر کچی مٹی اور پکی اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگوں نے خود ہی گھر بنائے ہوئے تھے۔ اس طرح ایک بستی سی بن گئی تھی۔ جسے لاہور میں کچی بستی کے نام سے جانا جاتا تھا۔

اب نبیل نے اپنی امی جان سے کہا "مجھے پرسوں ساگودانے کی کھیر پکا دینا۔ میں نے اپنے دوست کو ہسپتال میں ملنے جانا ہے۔ ساتھ کھیر لیتا جاؤں گا۔ کہتے ہیں کہ اس طرح کے اپریشن میں ہلکی غذا کھانی چاہیے"۔

اس دن صبح ہوتے ہی رزاق کی امی نے دیگچی چولہے پر چڑھا دی رزاق کی دادی نے پوچھا "بہو آج صبح صبح ہی دیگچی میں کیا پکا رہی ہو"۔

اس نے چولہے میں آگ تیز کرتے ہوئے اور آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے جو دھوئیں کی وجہ سے آگئے تھے، کہا "اماں جی، یہ آپ کے پوتے رزاق کا دوست ساتھ والے ہسپتال میں داخل ہے اور رزاق نے اس سے ملنے جانا ہے۔ کہ رہا ہے کہ میں ساگو دانے کی کھیر ساتھ لے کے جاؤں گا"۔

"واہ بھئی واہ! رزاق تو اب بڑا ہو گیا ہے۔ بہت اچھی چیز کا انتخاب کیا ہے اس نے اپنے دوست کے لیے"۔

اب ماں نے رزاق کو دیگچی صاف کر کے اوپر ڈھکن دے کر ایک شاپر میں ڈال دی۔ جب رزاق جانے لگا تو اس کے چھوٹے بھائی نے اسے دیکھ لیا وہ بھی ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔ رزاق نے ساتھ لے کر جانے سے انکار کیا تو وہ رونے لگا۔ امی نے اسے کہا "رزاق بیٹا! بھائی کو ساتھ لے جاؤ دیکھو وہ رو رہا ہے"۔

رزاق کہنے لگا "امی، راستے میں بہت گرمی ہو گی اور دھوپ بھی ہے۔ یہ اتنا نہیں چل سکے گا"۔

یہ سن کر اس کا چھوٹا بھائی روتے ہوئے بولا "میں چل لوں گا"۔

رزاق اپنے بھائی سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس کو روتے دیکھ کر اس نے اسے بھی ساتھ لے لیا اور دیگچی والا شاپر بھی اٹھا لیا۔ یوں وہ بڑے شوق سے اپنے قلمی دوست نبیل کو ملنے کے لیے چل پڑا۔ راستے میں بہت دھوپ تھی۔ تھوڑی ہی دور جا کر رزاق کے چھوٹے بھائی کی نکسیر پھوٹ پڑی۔ اس نے دیگچی والا شاپر ایک طرف رکھ کر اس کے سر پر پانی ڈالنا شروع کر دیا۔ ننھے اشفاق کی ناک سے خون بہنا تو بند ہو گیا لیکن اس کی ساری قمیص خون سے بھر گئی۔

رزاق دیکھ کر بولا "کوئی بات نہیں بھائی، آؤ چلیں ورنہ ملاقات کا وقت ختم ہو جائے گا۔ گھر واپس آ کر دوسری قمیص پہن لینا" پھر رزاق نے اپنے چلو سے اشفاق کو کچھ پانی بھی پلا دیا۔ اب ہسپتال کے بڑے گیٹ پر پہنچ کر رزاق نے جیب سے خط نکال کر وارڈ نمبر اور بیڈ نمبر دیکھا۔ پھر تھوڑا آگے بڑھا تو وہاں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس نے رزاق سے پوچھا "بچے کدھر جا رہے ہو؟"

"وارڈ نمبر 2 اور بستر نمبر 6 پر ایک نبیل نامی مریض داخل ہے۔ اس سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ وہ میرا بھائی

ہے۔

اس نے ایک نظر رزاق کی حالت کا جائزہ لیا اور شاپر میں دیگچی جو لکڑیوں کے دھوئیں سے سیاہ ہوئی تھی، دیکھ کر کہا "اچھا تو تم نبیل جو علی نواز کا بیٹا ہے اس سے ملنے آئے ہو اور اپنے کو اس کا بھائی بھی بتاتے ہو، وہ تو ایک مل مالک کا بیٹا ہے۔ وہ آپ کا بھائی کیسے ہو سکتا ہے۔ جاؤ بھاگو ادھر سے"۔

رزاق ننھے کو لے کر بہت مایوسی سے واپس گھر کی طرف چل دیا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ اسے سامنے سے ایک خوش لباس نوجوان آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹیھتی اسکوپ تھی۔ اس سے پتا چل رہا تھا کہ یہ ڈاکٹر ہو گا۔ اس نے رزاق کی طرف دیکھا پھر اس کے بھائی کی طرف دیکھا جس کی خون آلود قمیص دیکھ کر وہ سمجھا کہ یہ کوئی غریب مریض ہے۔ ہو سکتا ہے اسے ڈاکٹروں نے چیک نہ کیا ہو اس لیے مایوس واپس جا رہا ہے۔ اس نے رزاق سے پوچھا "لڑکے! اس بچے کو کیا تکلیف ہے؟"

رزاق نے کہا "سر! یہ مریض تو نہیں، اس کی تو ہسپتال آتے ہوئے نکسیر پھوٹ پڑی تھی"۔

"ہسپتال کیا لینے آئے تھے؟" نوجوان ڈاکٹر نے پوچھا۔

آئے تو ہم ایک مریض کی تیمار داری کے لیے تھے۔ لیکن ہسپتال کے عملے نے ہمیں اندر داخل ہی نہیں ہونے دیا"۔

اس نے رزاق کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "کیا نام ہے بیٹا آپ کا؟ اور کس مریض سے ملنے آئے تھے؟"

"میرا نام رزاق ہے اور میں نے نبیل نامی لڑکے سے ملنا تھا جو وارڈ نمبر2 اور بستر نمبر6 پر ہے"۔

"آؤ بیٹا رزاق میرے ساتھ، میں آپ کو نبیل سے ملواتا ہوں"۔

"رزاق اس نوجوان ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور اس سے پوچھنے لگا "بھائی صاحب، آپ نے کہاں جانا ہے؟"

میں بھی اسی ہسپتال میں جا رہا ہوں جہاں نبیل داخل ہے اور اس کا اپریشن بھی میں نے ہی کیا ہے"۔

یہ بات سن کر رزاق بہت حیران ہوا۔ مزید حیرانی اس کو اس بات پر ہوئی کہ یہ کتنا بڑا ڈاکٹر ہے اور اتنی سادہ زبان، اتنا سادہ لباس اور ہم غریبوں کے ساتھ بھی اس قدر خوش اخلاقی سے پیش آ رہا ہے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس ڈاکٹر نے پوچھا "رزاق بیٹا کون سی جماعت میں پڑھتے ہو؟"

رزاق جلدی سے بولا "آٹھویں میں، والدین ذرا غریب ہیں۔ اس لیے جوتے کپڑے اچھے نہیں پہن سکتا"۔

یہ فقرہ کہتے ہوئے رزاق بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر، رزاق کا یہ فقرہ سن کر بولا "میرے بھائی، غربت میں پریشان نہیں ہوتے۔ محنت کر کے پیسا کمانے والے غریب لوگ ہی تو اللہ کے دوست ہوتے ہیں۔ میں بھی جب پڑھتا تھا تو میرے والدین بھی بہت غریب تھے۔ میرا والد رکشا ڈرائیور تھا۔ ہمارے گھر میں آٹھ دن میں بس دو تین مرتبہ ہنڈیا پکتی تھی۔ ہم آٹھ بہن بھائی تھے۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی وکیل اور کوئی ٹیچر ہے۔ آپ بھی دل لگا کر پڑھا کرو۔ پڑھ لکھ کر امیر ہو جاؤ گے پھر اچھے کپڑے پہنا کرنا"۔

رزاق دل ہی دل میں اس ڈاکٹر کو دعائیں دے رہا تھا۔ ہسپتال کے گیٹ پر پہنچ کر رزاق رک گیا۔ ڈاکٹر نے اسے آگے آنے کو کہا تو وہ دونوں بھائی ڈاکٹر کے پیچھے چلتے ہوئے کمرہ نمبر2 کے پاس پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے ذرا رک کر کہا "لو بھئی رزاق آپ کی منزل تو آ گئی۔ آپ کا دوست اسی کمرے میں ہے"۔

رزاق ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتا ہوا کمرے کے اندر چلا گیا۔ اندر ایک لڑکا بیڈ پر نیم بے ہوش پڑا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ہائے ہائے کی ہلکی آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کے پاس بہت ہی اعلیٰ لباس میں ملبوس ایک عورت اور ایک مرد بیٹھے تھے۔ عورت نے ان دونوں بھائیوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر پوچھا "کون ہو تم؟"

رزاق نے فوراً کہا "ہمیں نبیل سے ملنا ہے۔

اس کا دوست رزاق ہوں"۔

یہ آواز نبیل کے کان میں بھی پڑ گئی۔ اس نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا اور بولا "بھائی آگے آؤ" اور پھر نبیل نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا۔

نبیل کا باپ اپنے بیٹے کے چہرے پر اتنے دنوں کے بعد مسکراہٹ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا "یہ قلمی دوستی بھی بہت کام کی چیز ہے"۔ پھر کہنے لگا "بیٹے رزاق آپ یہاں تک کیسے پہنچے؟"

رزاق نے اپنے وہاں تک پہنچنے کی ساری کہانی سناتے ہوئے کہا "پھر مجھے ایک ڈاکٹر نے جس نے نبیل کا اپریشن کیا ہے یہاں تک پہنچا دیا"۔

اچھا اچھا! وہ ڈاکٹر زبیر! وہ تو بہت اچھا ڈاکٹر ہے۔ غریب ماں باپ کا بیٹا ہے لیکن اس کا دل بہت اچھا ہے۔ وہ ڈاکٹر بننے کے باوجود بھی کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ میں بھی تمہاری اور نبیل کی طرح بچپن میں تعلیم و تربیت پڑھتا تھا۔ اور حسن اتفاق یہ کہ ڈاکٹر زبیر بھی تعلیم و تربیت کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتا تھا۔ آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو گی کہ ہماری تعلیم و تربیت کی وجہ سے ایک دوسرے سے قلمی دوستی ہو گئی اور وہ دوستی اب تک قائم ہے۔ ہم اب بھی ٹیلی فون پر ایک دوسرے کے حالات معلوم کرتے رہتے ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں ڈاکٹر زبیر سے بیٹے کے اپریشن کا ذکر کیا تو اس نے فوراً مجھے لاہور آنے کو کہا۔ خدا بخشے نبیل کے دادا ابو کو وہ بھی جب بیمار ہوئے تو اس ڈاکٹر نے مجھ سے بڑھ کر ان کی خدمت کی اور علاج میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ تو خدا کی قدرت تھی کہ وہ اتنی کوشش کے باوجود صحت یاب نہ ہو سکے۔ میری آنکھوں کے آگے ڈاکٹر زبیر کا وہ جذبہ اب بھی گردش کر رہا ہے۔ میں زبیر کو اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ ویسے بھی میرا کوئی بھائی نہ تھا۔ مجھے ان دنوں فیکٹری میں ضروری کام کے لیے دو دن رکنا پڑا تھا۔ ادھر میرے والد بزرگ وار زندگی اور موت کی کش مکش میں تھے۔ ڈاکٹر زبیر نے مجھ سے کہا "بھائی جان' آپ کے والد میرے بھی تو والد ہیں جائیں آپ کراچی چلے جائیں اور تسلی سے اپنا کام نپٹا کے آئیں' میں ان کا مکمل علاج بھی کروں گا اور ہر طرح کی دیکھ بھال بھی کروں گا۔ میرے بعد میرے والد کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر زبیر دن رات ان کے پاس رہے اور جب میں واپس آیا تو میرے پہنچنے سے کوئی پندرہ منٹ پہلے میرے والد اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچ چکے تھے اور ڈاکٹر زبیر غم سے اس قدر نڈھال ہو رہا تھا کہ میں رونے اور پریشان ہونے کے بجائے ڈاکٹر زبیر کو تسلی دینے لگا۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے قلمی دوستی کے ذریعے ایسا مخلص بھائی عطا کیا ہے کہ میں ساری عمر تعلیم و تربیت کا یہ احسان نہیں بھلا سکتا۔ نبیل کے والد نے رزاق کو پکڑ کر پاس بٹھایا۔ خوب پیار کیا اور کہا "بیٹا رزاق' آپ کو نبیل بھی تو قلمی دوستی کے ذریعے ہی ملا ہے۔ اب تم بھی اس قلمی دوستی کو بھائی کے روپ میں بدل دینا"۔

یہ بات سن کر رزاق کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اب رزاق اور نبیل ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے مدت سے بچھڑے بھائی ایک دوسرے سے ملے ہوں۔

کارٹون کہانی

ملاّ گئے مچھلی کے شکار کو

شاہد ریاض شاہد

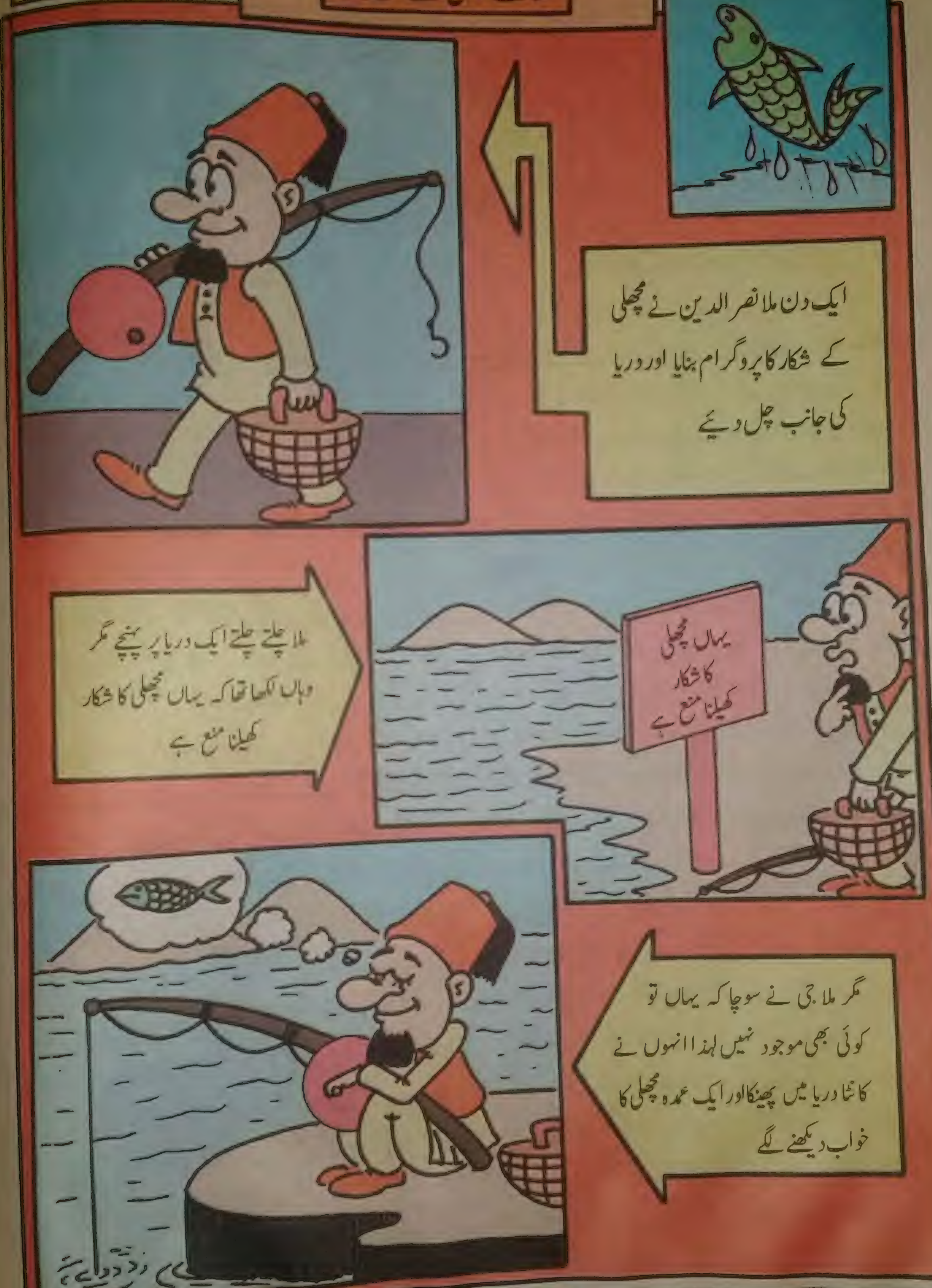

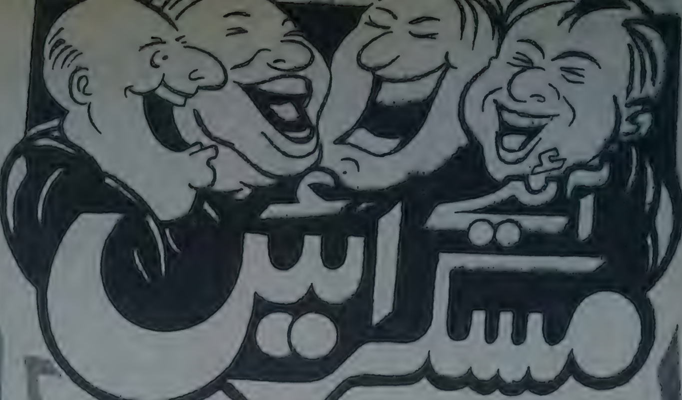

گاہک (حمام والے سے): یہ تولیہ بڑا گندہ ہے استعمال کے قابل نہیں۔

حمام والا: عجیب بات ہے! صبح سے پچاس ساٹھ آدمی اس تولیے کو استعمال کر چکے ہیں لیکن کسی نے بھی شکایت نہیں کی (ناصر نسیم چنیوٹ)

سیاست دان (ڈاکٹر سے): جب میں تقریر کرتا ہوں تو میری زبان تالو سے چمٹ جاتی ہے اور ہونٹ کانپنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر: یہ کوئی بیماری نہیں، جھوٹ بولتے وقت ایسا ہی ہوتا ہے۔ (صائمہ جہان، مقام نہیں لکھا)

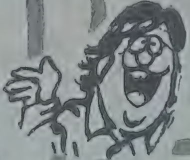

ایک وزیر کسی پٹرول پمپ کا افتتاح کرنے گئے۔ جب افتتاح ہو چکا تو وزیر صاحب نے پٹرول پمپ کے مالک سے پوچھا۔ "بہت خوب! مگر آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ زمین کے اس مخصوص حصے میں پٹرول موجود ہے؟" (افشاں ارجمند ڈیرہ غازی خان)

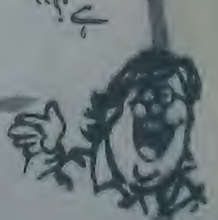

استاد (شاگرد سے) مرغی انڈوں پر کیوں بیٹھتی ہے؟

شاگرد: جناب، اس لیے کہ اس کے ڈربے میں کرسی نہیں ہوتی (صوفیہ اسلم بہاول پور)

دو مصور اپنے اپنے فن کی تعریف کر رہے تھے۔ ایک خود کو دوسرے سے زیادہ ماہر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پہلا مصور: میں نے انگور کا ایک گچھا بنایا جو اس قدر اصلی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بلبل آ کر اسے چونچ مارنے لگی۔

دوسرا مصور: وہ بلبل میں نے ہی تو بنائی تھی جو اڑ کر گچھے تک پہنچ گئی تھی (انجم سہیل مغل اوکاڑہ)

ایک آدمی ہانپتا کانپتا گھر پہنچا۔ اور اپنی بیوی سے کہنے لگا "آج میں نے پورے دو روپے کی بچت کی ہے۔

بیگم: وہ کیسے؟

شوہر: میں آج ایک بس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا ہوں۔ اگر بس میں آتا تو 5 روپے کرائے پر خرچ ہو جاتے۔

بیگم: ارے! اگر بچت ہی کرنی تھی تو کسی ٹیکسی کے پیچھے بھاگتے، کم از کم چالیس پچاس روپے کی بچت تو ہوتی (نعیم اللہ مروت پشاور)

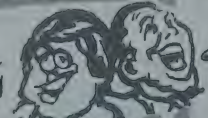

ایک جیب کترا بڑے غور سے فیشن میگزین دیکھ رہا تھا۔ اس کے شاگرد نے اس سے پوچھا "تم ہر مہینے فیشن میگزین کا مطالعہ کیوں کرتے ہو؟"

جیب کترا: میں مطالعہ تھوڑی کرتا ہوں میں تو صرف تصویریں دیکھتا ہوں"۔

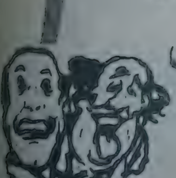

شاگرد: وہ کیوں

جیب کترا: اس لئے کہ پتا چل سکے کہ آئندہ جیبیں کہاں سلوانے کا فیشن چلے گا"۔

(راجا عدیل آصف اسلام آباد)

شکیل زاہد

خلائی کان

ندیم احمد اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ گرمیوں میں پہاڑی علاقے کی سیر کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ ندیم صاحب یوں تو ایک فیکٹری کے مالک تھے لیکن ان کے شوق بہت عجیب و غریب تھے۔ انہیں پرخطر جگہوں پر جانے اور وہاں کی تصویریں لینے کا بہت شوق تھا۔ اس کے علاوہ انہیں ہوائی جہاز اڑانے کا بھی شوق تھا۔ ان کے پاس ایک ذاتی ہوائی جہاز تھا جس پر وہ' ان کے دوست یا ان کے گھر والے پورے ملک کی سیر کیا کرتے تھے۔

اس بار ان کا ارادہ اپنے ملک کے ٹھنڈے پہاڑی علاقوں میں جانے کا تھا۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ سب سے بڑا بیٹا ہاشم آٹھویں میں پڑھتا تھا اور اس کے شوق بھی بالکل باپ کی طرح تھے۔ اسے بھی ایسی مہمات دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ دو بار اپنے والد کے ساتھ سندھ کے جنگلوں اور سمندر کی سیر کے لیے جا چکا تھا۔ دوسرا بیٹا امجد چوتھی میں پڑھتا تھا اور ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار رہتا تھا جو اس کا بڑا بھائی کرتا تھا۔ لڑکی عنبرین البتہ کتابی کیڑا تھی۔

ندیم صاحب کا جہاز ہوائی اڈے سے اڑا تو فوراً ہی نیچے پہاڑ نظر آنے لگے۔ ہاشم نے ہوائی جہاز سے پہلی بار پہاڑوں کا نظارہ کیا تھا۔ وہ کھڑکی سے چپک کر رہ گیا تھا۔

"ابو یہ تو بہت خوبصورت ہیں" اس نے ہرے بھرے جنگلات کے اوپر سے گزرتے ہوئے کہا۔

"وہ بائیں جانب بھی برف پوش پہاڑیاں ہیں" ندیم صاحب نے کہا "لیکن ہمارا راستہ دوسرا ہے"۔

تھوڑی دیر بعد ہی انہیں زیادہ اونچے پہاڑ نظر آنے لگے۔ وہ ان پہاڑوں کے اوپر سے گزرے تو آگے برف پوش چوٹیاں کھڑی تھیں۔

"ہاشم دیکھو پہاڑوں پر برف جمی ہوئی ہے" امجد نے کہا۔

"ابو کیا یہ کے۔ ٹو ہے؟" ہاشم نے پوچھا۔

ندیم صاحب ہنس پڑے "ارے نہیں بھئی' کے۔ ٹو تو بہت اونچا ہے۔ ہم وہاں تک نہیں جا سکتے۔ یہ کشمیر کا علاقہ ہے"۔

عین اسی وقت جہاز کے انجن میں سے گھر گھر کی آوازیں آنے لگیں اور جہاز کانپنے لگا۔ "یا الٰہی خیر" امی گھبرا کر بولیں "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ندیم صاحب کے چہرے سے بھی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ "پتا نہیں اس سے پہلے تو....." ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اچانک جہاز نے ایک زور کا جھٹکا کھایا اور اس کی ناک زمین کی طرف ہو گئی۔

وہ تیزی سے نیچے کی طرف جا رہے تھے۔ بچے بری طرح چیخنے لگے۔ ندیم صاحب نے جہاز کو کنٹرول میں کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بالکل بے قابو ہو چکا تھا۔ انہوں نے کنٹرول ٹاور سے رابطہ کیا۔ "ہیلو کنٹرول ٹاور! ہمارے جہاز میں خرابی ہو گئی ہے' ہم نیچے کی طرف گر رہے ہیں"۔

"جہاز کو سیدھا کرنے کی کوشش کریں"۔

"میں کوشش کر رہا ہوں" ندیم صاحب پسینے میں بری

طرح نہا گئے تھے۔ زمین تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ سب کو یقین ہو گیا تھا کہ اب آخری وقت آن پہنچا ہے۔

اچانک جہاز کو ایک اور جھٹکا لگا اور وہ سیدھا ہونے لگا۔ اس کے نیچے گرنے کی رفتار کم ہو گئی۔ یہ کیسے ہوا؟ یہ سوچنے کا فی الحال وقت نہیں تھا۔ ندیم صاحب نے جہاز کو تیزی سے اوپر اٹھایا۔ لیکن وہ بہت زیادہ نیچے آ چکے تھے۔ ان کے بالکل سامنے ایک پہاڑ سینہ تانے کھڑا تھا۔ انہوں نے جہاز کو دائیں جانب موڑا۔ وہ چاہتے تھے کہ جہاز کو پہاڑ کے دائیں جانب سے کاٹ کر گزار دیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ وہاں ایک بہت گھنا جنگل ہے۔ جہاز پہاڑ سے تو بچ گیا لیکن اس کے پر ایک درخت کی چوٹی سے ٹکرا گئے۔

جہاز بری طرح ڈولا۔ ندیم صاحب نے جہاز کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک چھوٹی سی کھلی جگہ میں جا گرا۔

جہاز کے پے در پے جھٹکے کھانے کی وجہ سے ندیم صاحب، امی اور بچوں کو کئی چوٹیں آئی تھیں۔ لیکن چوں کہ جہاز پہلے درختوں سے ٹکرا گیا تھا، اس لیے اس کے گرنے کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ جب وہ زمین پر گرا تو انہیں ایک زور دار جھٹکا لگا۔ ندیم صاحب کی سیٹ ٹوٹ کر آگے ہو گئی اور وہ اس میں بری طرح پھنس گئے۔

پہلے تو کسی کو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ زندہ بچ گئے ہیں۔ جب ان کے ہوش ٹھکانے آئے تو انہیں سب سے پہلے باہر نکلنے کی فکر ہوئی۔ ہاشم کو جہاز کا دروازہ کھولنا آتا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ پھر باری باری امی، امجد اور عنبرین بھی باہر آئے۔ ندیم صاحب بری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ ہاشم دوبارہ اندر گیا اور انہیں نکالنے کی کوشش کی لیکن کام یابی نہیں ہوئی۔

"ٹرانس میٹر آن کرو" ندیم صاحب نے کہا۔

ہاشم نے ٹرانس میٹر کا بٹن دبایا لیکن اس کی لائٹ نہیں جلی۔ ندیم صاحب کی آنکھوں میں خوف آگیا۔ "اف میرے خدایا! اب ہم کیا کریں گے؟ ہمیں اس جنگل میں بچانے کے لیے کون آئے گا؟"

ندیم صاحب کے جملے سے ہاشم کو پتا چلا کہ وہ جہاز کے گرنے سے تو زندہ بچ گئے ہیں لیکن جنگل میں قید ہو گئے ہیں۔ جہاں ہر طرف خوفناک درندے موجود ہیں۔ اس نے کشمیر کے جنگلوں کے چیتے کا ذکر اکثر سنا تھا۔ اس نے دیکھا کہ رات ہونے والی ہے۔ اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔

آپ کے ساتھ تو یقیناً اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ہو گا۔ لیکن اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ پیش آ بھی سکتا ہے۔ سمندری طوفان کے باعث کوئی جہاز پھنس سکتا ہے یا جہاز میں کوئی خرابی ہو جائے اور وہ بیچ سمندر موجوں کے رحم و کرم پر ادھر سے ادھر ڈولتا رہے۔ آپ کسی دور افتادہ جگہ کار پر جا رہے ہوں اور کار اچانک خراب ہو جائے اور دور دور تک کوئی آبادی بھی نہ ہو۔ ایسی صورت میں سب سے پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟ یہی کہ کسی طرح دوسروں کو یہ بات بتائی جائے کہ ہم مشکل میں ہیں۔

اس کا ایک حل خلائی تحقیق نے ممکن بنا دیا ہے۔ آپ لوگوں نے مصنوعی سیاروں کا نام تو سنا ہو گا۔ آپ جانتے ہوں گے کہ وہ کیا ہوتے ہیں۔ خلائی سیارے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بہت بلندی پر ہوتے ہیں۔ ان کا زمین سے فاصلہ تقریباً 36000 کلو میٹر ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جو زمین کے قریب ہوتے ہیں۔ انہیں لیو (LEO) یعنی LOW EARTH ORBIT کہا جاتا ہے اور ان کا زمین سے فاصلہ تقریباً 800 کلو میٹر ہوتا ہے۔ امریکا اور روس نے خلا میں چند ایسے سیارے بھیجے ہیں اور یہ زمین کے گرد مسلسل چکر لگا رہے ہیں۔ اس وقت ان کی تعداد چھ ہے۔ ان میں سے چار امریکا کے ہیں اور دو روس کے۔ روسی سیاروں کو کاس پاس (COS PAS) کہتے ہیں اور امریکی سیاروں کو سار سیٹ (SAR SAT)۔ اس طرح یہ سسٹم کاس پاس سار سیٹ کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے تلاش کرنے اور پانے والے سیارے۔

ہوتا یہ ہے کہ بحری جہاز، ہوائی جہاز یا وہ شخص جو دور دراز کے علاقوں میں جا رہا ہو اپنے ساتھ ایک ٹرانس میٹر رکھ لیتا ہے جسے بیکن (BEACON) کہا جاتا ہے۔ مشکل پڑنے پر وہ اس بیکن کو آن کر دیتا ہے۔ بعض بیکن جھٹکا لگنے سے خود بخود بھی آن ہو جاتے ہیں۔ اگر مشکل پڑنے پر اس بیکن کو آن کر دیا جائے تو ان چھ سیاروں میں سے کوئی بھی تقریباً ایک گھنٹے کے وقفے سے اس جگہ کے اوپر سے گزرے گا۔ اگر بیکن آن ہو گا تو سیارہ اس کی آواز سن لے گا اور اس کی جگہ کا تعین بھی کرے گا کہ وہ کہاں ہے۔ ان معلومات سے یہ پتا چلانا بھی ممکن ہو جاتا ہے کہ یہ بیکن کس شخص یا ادارے نے کب خریدا تھا۔ اس طرح بیکن آن کرنے والے کی شناخت بھی ہو جاتی ہے۔

دنیا میں کل 24 ایسے زمینی اسٹیشن موجود ہیں جو ان سیاروں کی بھیجی ہوئی معلومات کو پڑھ سکتے ہیں۔ جب وہ سیارہ ان 24 اسٹیشنوں میں سے کسی ایک کے اوپر سے گزرتا ہے تو اپنی موصول شدہ معلومات اسے بھیج دیتا ہے۔ ایسے اسٹیشن کو ایل یو ٹی (LOCAL, USER TERMINAL) کہتے ہیں۔ اس میں سٹیلائٹ ریسیور ہوتا ہے اور ایک نہایت طاقتور کمپیوٹر لگا ہوتا ہے۔ وہ کمپیوٹر سیارے سے آنے والی معلومات میں سے بیکن کی جگہ اور بیکن کی شناخت سے متعلق معلومات کو علیحدہ کرلیتا ہے اور یہ معلومات جسے خطرے کا پیغام (MESSAGE A LERT) کہا جاتا ہے، ایک اور سنٹر کو جسے ایم سی سی (MISSION CONTROL CENTRE) کہتے ہیں کو بھیج دیتا ہے۔ وہاں بھی ایک کمپیوٹر ہوتا ہے جس پر دنیا کا نقشہ نظر آرہا ہوتا ہے۔ یہ کمپیوٹر ایل یو ٹی پیغام کو اپنی اسکرین پر ایک سرخ نقطے کی شکل میں دکھا دیتا ہے۔ وہ نقطہ نقشے پر اس جگہ ہوتا ہے جہاں وہ بیکن موجود ہوتا ہے۔ اس نقطے میں بیکن کی شناخت، اس کا جائے وقوع، تاریخ اور وقت موجود ہوتا ہے۔ اس میں یہ بھی موجود ہوتا ہے کہ سیارے نے بیکن سے آنے والی معلومات کو کتنی دفعہ پڑھا۔

اب جو شخص سمندر یا پہاڑی جنگل میں پھنسا ہوا ہو اس کی مدد کی فریاد زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں لوگوں تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر وہ بیکن ایم سی سی کے علاقہ کا ہو تو یہ معلومات فوری طور پر آر سی سی (Rescu Co -ordination Centre) کو پہنچا دی جاتی ہے۔ جہاں سے مدد کرنے والی ٹیمیں ہیلی کاپٹر یا کسی اور ذریعے سے فوراً مصیبت میں پھنسے لوگوں کی مدد کے لیے روانہ ہو جاتی ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ خلائی تحقیق نے کس طرح انسانوں کو مشکل سے نکالنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے؟ یہ سیارے مسلسل گردش میں ہیں۔ ایل یو ٹی، ایم سی سی اور آر سی سی بھی 24 گھنٹے مستعد ہیں۔ اگر دنیا میں کسی بھی جگہ کوئی بیکن آن ہو تو وہ چھپا نہیں رہ سکتا۔

پاکستان میں بھی ایل یو ٹی اور ایم سی سی موجود ہیں جو پاکستان کے خلائی تحقیقاتی ادارے سپارکو نے لاہور میں لگائے ہیں۔ یہ ہمہ وقت کام کرتے ہیں۔ پاکستان، ایران، ترکی، افغانستان، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، عراق، کویت، عمان، بحرین، قطر، یمن یا اردن میں اگر کبھی کوئی بیکن آن ہو تو یہ فوری طور پر متعلقہ جگہ پر معلومات پہنچا دیتے ہیں۔ اگر وہ بیکن پاکستان میں ہو تو مددگار ٹیمیں انہیں بچانے کے لیے مناسب اقدامات کرتی ہیں اور اگر دوسرے ممالک میں ہو تو ان ممالک تک یہ اطلاع فوری طور پر پہنچا دی جاتی ہے۔

سب سے پہلے ستمبر 1982ء میں کینیڈا کے علاقے برٹش کولمبیا کے سنگلاخ پہاڑوں میں پھنسے ہوئے تین افراد کو اس سسٹم سے بچایا گیا۔ وہ افراد ایک جہاز کے پہاڑوں میں گرنے کی وجہ سے وہاں پھنس گئے تھے۔ تب سے لے کر آج تک ہزاروں افراد کو اس سسٹم کی مدد سے بچایا جا چکا ہے اور ہر سال یہ سینکڑوں افراد کی مدد کرتا ہے۔ کہانی کے شروع میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ تو صرف آپ کو سمجھانے کے لیے ایک فرضی واقعہ ہے۔

لیکن اگر آپ کسی مشکل مقام کی طرف سفر کر رہے ہوں تو ایک بیکن لے جانا نہ بھولیے گا۔ اگر خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو یہ خلائی کان آپ کے کام آئیں گے۔

الزام

عظیم اختر میمن

یہ قیام پاکستان کے چند ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ ان دنوں ہم کراچی میں رہتے تھے۔ میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ سردیوں کی ایک ٹھنڈی شام تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس دن بھی میں گھر کے قریبی میدان میں اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا۔ جہاں ہم کرکٹ کھیل رہے تھے اس سے کچھ فاصلے پر جاوید ہمیں کرکٹ کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حسرت تھی۔ جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے

"احمد!" اسلم نے مجھے پکارا۔

"ہوں.... کیا بات ہے" میں نے اسلم کے نزدیک آکر کہا۔

"جاوید کو دیکھ رہے ہو تم.... ایسی ندیدی نگاہوں سے گیند اور بلے کو دیکھ رہا ہے جیسے ابھی لے کر بھاگ جائے گا"

اسلم نے جاوید کو غصے سے بھری ہوئی نگاہوں سے گھورا۔

"ظاہر ہے! چور کی اولاد، چوری کے سوا کیا کام کر سکتی ہے" حامد نے بیچ میں لقمہ دیا۔

"کیا خیال ہے۔ جاوید کو میدان سے باہر نہ نکال دیں" میں نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو یار، ہمارا کیا جاتا ہے۔ دیکھنے دو اسے.... ہاں اگر اس نے ایسی ویسی حرکت کی تو ہم اسے خود ہی دیکھ لیں گے" ہارون نے ہمیں سمجھاتے ہوئے کہا اور ہم سب دوبارہ کھیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقت اسلم بیٹنگ کر رہا تھا اور ہارون باؤلنگ کروا رہا تھا۔ ہارون نے جیسے ہی گیند پھینکی اسلم نے آگے بڑھ کر ایک زوردار شاٹ کھیلا۔ گیند جاوید کے سر سے ہوتی ہوئی پیچھے جھاڑیوں میں جا گری۔

"احمد بھائی، آپ ٹھہریں میں آپ کو گیند لا کر دیتا ہوں" جاوید نے مجھ سے کہا اور جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"یار! کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ گیند لے کر ادھر سے ہی بھاگ جائے" اسلم کو گیند کی فکر پڑ گئی تھی اور ہم نے اس طرف جھاڑیوں میں دیکھا جہاں جاوید گیا تھا۔

"کیا ہوا جاوید! گیند مل گئی تمہیں...." ہارون نے جاوید سے پوچھا۔

"نہیں ہارون بھائی، گیند تو نہیں مل رہی مجھے"۔

"ضرور اس نے گیند یا تو اپنی جیب میں ڈال لی ہو گی یا پھر کہیں چھپالی ہو گی، تاکہ ہمارے جانے کے بعد بڑے آرام سے وہاں سے نکال لے" اسلم نے تیز لہجے اور بلند آواز میں کہا۔ جو شاید جاوید نے سن لیا تھا۔

"نہیں! اسلم بھائی، میں چور نہیں ہوں" جاوید نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"پھر.... گیند کہاں گئی؟"

"مجھے نہیں معلوم آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں" جاوید بولا۔

"شرافت سے بتا دو۔ گیند کہاں چھپائی ہے تم نے ورنہ...." اسلم نے اس کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اسلم بھائی، مجھے نہیں معلوم گیند کہاں ہے؟" جاوید نے اپنی صفائی پیش کی تو اسلم کو جیسے غصہ آگیا۔ اس نے جاوید کو ایک زوردار تھپڑ مارا تو جاوید کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

"کیا! کر رہے ہو، اسلم تم.... پاگل ہو گئے ہو کیا...!" ہارون

نے اسلم کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو مجھے، جب تک یہ مجھے سچ سچ نہیں بتائے گا میں اسے نہیں چھوڑوں گا"۔

"کیا بات ہے اسلم، محلے میں کہیں بھی چوری ہوتی ہے تو تم سب لوگ بے چارے جاوید پر الزام کیوں لگاتے ہو؟ کیا کبھی کسی نے اس کو چوری کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ اس کا باپ چور تھا تو اس میں اس کا کیا قصور؟ آخر تم لوگ اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟" ثاقب جو ابھی ابھی میدان میں داخل ہوا تھا۔ اس نے ہمیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہم کچھ نہیں جانتے ہمیں اپنی گیند چاہیے"۔

"یہ لو، پیسے، تم نئی گیند خرید لینا۔ خبردار! آئندہ تم لوگوں میں سے کسی نے جاوید پر کوئی الزام لگایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا" ثاقب نے اپنی جیب سے کچھ پیسے نکال کر اسلم کی طرف بڑھائے۔

"آؤ جاوید بھائی!" یہ کہ کر ثاقب نے جاوید کے ساتھ میدان کے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

جاوید ہمارا پڑوسی ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارا ہم جماعت بھی تھا۔ اس کے ابو چند سال پہلے چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ پھر ان کا جیل میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ جاوید کی والدہ لوگوں کے کپڑے سی کر گھر کا خرچ چلاتی تھیں۔ محلے کے سب لوگوں کو جاوید اور اس کی والدہ سے ہمدردی تھی۔ لیکن ہم سب محلے کے لڑکے جاوید سے سخت نفرت کرتے تھے اور اسے چور سمجھتے تھے۔

"احمد! کچھ سنا تم نے؟" اسکول کے ہاف ٹائم میں میں کباب کے ٹھیلے پر کھڑا کباب کھا رہا تھا کہ اسلم نے مجھ سے کہا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟ اتنے جلے بھنے ہوئے کیوں ہو؟" میں نے اسلم سے پوچھا۔

"جاوید! آیا تھا میرے پاس چندہ مانگنے کے لیے"۔

"کس چیز کا چندہ؟" حامد نے پوچھا۔ وہ اور ہارون ہمیں یہاں کھڑا دیکھ کر یہیں آ گئے تھے۔

"یہ تو میں نے اس سے نہیں پوچھا۔ ہاں البتہ باقی لڑکے تو اسے چندہ دے رہے تھے اور جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے اس کی بات نہیں سنی اور اسے بھگا دیا" اسلم نے بتایا۔

"ضرور یہ اس کی چال ہو گی۔ وہ اس طرح چندے کے بہانے پیسے ہتھیانا چاہتا ہے۔ پتا نہیں لڑکے اسے چندہ کیوں دے رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یار! اسکول کے لڑکوں کو کیا معلوم کہ اس کا باپ چور تھا۔ ہمیں چل کر سب لڑکوں کو خبردار کرنا چاہیے"۔ اور ہم سب اس طرف چل دیے۔ جہاں جاوید لڑکوں سے چندہ اکٹھا کر رہا تھا۔

"آخر تم لوگ اس کو کس چیز کا چندہ دے رہے ہو.... تم نہیں جانتے اسے؟ اس کا باپ چور تھا۔ یہ ضرور اپنی کوئی جھوٹی مجبوری بتا کر آپ لوگوں سے چندہ مانگ رہا ہو گا۔ ہم اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسے چندہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں" میں نے بلند آواز میں کہا۔

جاوید کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ "نہیں، احمد بھائی" جاوید نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کے لیے اتنا بڑا الزام مت لگایئے مجھ پر۔ میں نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔ میں پوچھتا ہوں اگر میرا باپ چور تھا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اور یہ میں جو چندہ اکٹھا کر رہا ہوں اپنے لیے نہیں کر رہا بلکہ یہ چندہ ان مہاجرین کے لیے اکٹھا کر رہا ہوں جو اپنا سب کچھ لٹا کر پاکستان آئے ہیں۔ لیکن افسوس! آپ لوگوں نے میرے اس نیک کام کو بھی برا سمجھا" یہ کہ کر جاوید وہیں زمین پر بیٹھ کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ہم سب حیران و پشیمان نظروں سے جاوید کو دیکھنے لگے۔ ہمیں اپنی تمام کوتاہیاں یاد آ رہی تھیں۔ جاوید کے ساتھ ناروا سلوک، اپنے طنزیہ جملے اور اتنے برے سلوک، کے باوجود جاوید کا اچھا سلوک میں نے جاوید کے پاس جا کر اس کے چہرے سے اس کے ہاتھ ہٹائے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

"جاوید! ہم معافی کے لائق تو نہیں ہیں۔ لیکن تمہارا دل تو بہت بڑا ہے۔ کیا تم ہمیں معاف نہیں کر سکتے؟"

جاوید اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھ سے گلے لگ گیا اور ہم سب جاوید کے ساتھ چندہ اکٹھا کرنے کے لیے چل دیے۔

☆ ☆ ☆

دل چسپ اور ناقابلِ یقین

عبدالستار خان طاہر

موت کا سگرٹ

امریکا کے شہر لاس اینجلس میں 1991ء کے شروع میں سگرٹوں کا ایک نیا برانڈ تیار کیا گیا۔ ان کا پیکٹ بالکل سیاہ رکھا گیا۔ اس پر انسانی کھوپڑی اور بازوؤں کی ہڈیوں کا کراس دکھایا گیا۔ (یہ موت کی مشہور نشانی ہے) پیکٹ پر سگرٹ کا نام لکھا گیا ہے "موت"۔ ہر پیکٹ کے ایک طرف یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔ "اگر آپ سگرٹ نہیں پیتے تو شروع نہ کریں۔ اگر پیتے ہیں تو چھوڑ دیں" کمپنی نے کہا ہے کہ یہ سگرٹ بازار میں آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پچیس ہزار پیکٹ فروخت ہو گئے۔ ہے ناں حیرت کی بات؟ اور ہاں پاکستان میں بھی تو سگرٹ کے ہر پیکٹ پر یہ لکھا ہوتا ہے "خبردار سگرٹ نوشی صحت کے لیے مضر ہے۔ وزارت صحت" مگر پھر بھی لوگ سگرٹ پینے سے باز نہیں آتے۔

خلا میں کوڑا کرکٹ

خلا اور فلکیات کے ماہرین نے کہا ہے کہ خلا میں چھوڑے ہوئے مصنوعی سیاروں کے ہزارہا ٹکڑے خلا میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ ہزاروں چھوٹے بڑے مصنوعی سیارے خلا میں بھیجے جا چکے ہیں۔ ان میں بعض ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ ریسرچ کرنے والوں نے بتایا ہے کہ سات ہزار ٹکڑے جو ٹینس بال کے سائز کے ہیں' خلا میں بھٹک رہے ہیں۔ ان کے علاوہ 35 لاکھ چھوٹے سائز کی ہیں جو خلا میں اڑتی پھر رہی ہیں۔ ان میں زیادہ تر اشیاء خلا نوردوں کی پھینکی ہوئی ہیں۔ جرمنی کے اخبار "دی جرمن ٹری بیون" نے لکھا ہے کہ یہ کوڑا کرکٹ اگر کسی مصنوعی سیارے سے ٹکرا جائے تو بہت خطرناک صورت حال پیدا کر سکتا ہے۔ پینٹ کا ٹکڑا تک بھی چالیس ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے اڑتا ہے اور یہ دوسرے سیارے کو تباہ کر سکتا ہے۔ سائنس دانوں نے کہا ہے کہ یہ ٹکڑے خلا میں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر خلائی گرد پیدا کر رہے ہیں۔ یہ گرد کسی وقت زمین کے گرد رنگ کی صورت میں آ سکتی ہے۔ جیسے سیارہ زحل کے گرد گیس کا رنگ ہے اور پھر اس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

وار برٹن

پاکستان کے صوبہ پنجاب میں "واربرٹن" نام کا قصبہ ہے۔ اصل میں قصہ یہ ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے انگریزوں کے دور میں وار برٹن پنجاب پولیس کا ایک انگریز ایس پی تھا۔ وہ اتنا بہادر تھا کہ بھیس بدل کر ڈاکوؤں کے ٹھکانوں تک تن تنہا پہنچتا اور انہیں گرفتار کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے رات کے وقت ڈاکوؤں کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے چناب تیر کر پار کیا تھا اور ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس قصبے کا نام اسی کے نام پر وار برٹن رکھا گیا۔

عجیب و غریب کمرا

1002 ہجری میں حکیم علی نے جو دربار اکبری کا شاہی طبیب تھا، آگرہ میں پانی کا ایک حوض تیار کرایا تھا، حوض کے نیچے ایک کمرا بنایا گیا تھا جس میں دس بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ کمرا نہایت روشن اور ہوا دار تھا۔ حکیم صاحب اس کمرے میں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے تھے۔ کمرے میں جانے کے لیے حوض کی تہ میں زینہ تھا، زینے سے گزر کر کمرا آتا تھا۔ جس کے دالان میں خشک کپڑے رکھے ہوتے تھے۔ کمرے میں جانے والا بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر خشک کپڑے پہن لیتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کمرے میں پانی کا گزر تو ایک طرف نمی تک کا اثر نہیں پہنچتا تھا۔ ہوا پانی کو اندر پہنچنے سے نہ صرف باز ہی رکھتی تھی۔ بلکہ اس کی نمی کو بھی دور کرتی رہتی تھی۔ 1016 ہجری میں شہنشاہ جہانگیر نے اس کمرے کے دیکھنے کی خواہش کی اور حسب معمول حوض میں اتر کر اپنے ساتھیوں کے ہم راہ اس عجیب و غریب کمرے کی سیر کی۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر لطف اندوز ہوا اور حکیم صاحب کو دو ہزاری منصب سے سرفراز کیا۔

بغل کی زبان

1004 ہجری میں اکبر کے دربار میں ایک اندھا پیش ہوا جو بغل کے نیچے ہاتھ رکھ کر زبان کے بجائے ہاتھ اور بغل کی آواز سے باتیں کرتا تھا اور جو کچھ زبان سے کہا جا سکتا ہے وہ بغل کی آواز سے بیان کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اسی آواز سے اشعار سناتا تھا۔

آسمانی تلواریں

شہنشاہ جہاں گیر کے دور میں ضلع جالندھر کے ایک گاؤں میں آسمان سے کسی کرہ کا ٹکڑا ٹوٹ کر جو بجلی سے زیادہ روشن تھا زمین پر گرا اور اندر دھنس گیا، محمد سعید حاکم پرگنہ کو اطلاع دی گئی، وہ فوراً موقع پر پہنچا تو دیکھا کہ دس بارہ گز تک گھاس جل گئی تھی اور ابھی تک حرارت کا اثر باقی تھا۔ درمیان میں گڑھا پڑ گیا تھا۔ گڑھے کو چاروں طرف سے کھودا گیا، جوں جوں کھودتے جاتے تھے حرارت کی زیادتی ہوتی جاتی تھی، کافی کھدائی کے بعد لوہے کا ایک کافی بڑا گرم ٹکڑا دکھائی دیا جو اتنا گرم تھا کہ گویا ابھی بھٹی سے گیا ہے۔ ٹھنڈا ہو جانے پر جہانگیر کے دربار کو روانہ کیا گیا۔ جہانگیر نے داؤد آہن گر کو، جو تلوار بنانے میں مہارت رکھتا تھا، تلوار بنانے کا حکم دیا۔ اس نے دو تلواریں، ایک خنجر اور ایک چھری بنا کر پیش کیں، یہ تلواریں فولادی تلواروں کی طرح مڑ جاتی تھیں اور کاٹ میں اصلی تلواروں سے بڑھ کر ثابت ہوئیں۔

انوکھا فیشن

وسطی افریقہ میں بعض قبائل کی لڑکیوں کے اوپر والے سامنے کے دو دانت توڑ دیئے جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہاں کے لوگ ٹوٹے ہوئے دانتوں کو حسن کی علامت سمجھتے ہیں۔ یہ دانت دو پتھروں سے بڑے ظالمانہ طریقے سے توڑے جاتے ہیں۔ لیکن وہاں کی لڑکیاں بڑے شوق سے دانت تڑواتی ہیں۔

عجیب بات

زمین پر قدم جمانے کے لیے ہمیں صرف دو تین گرہ زمین کافی ہوتی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جب ہم کسی دیوار پر دوڑنا چاہیں جو دس بارہ گرہ چوڑی ہو تو یہ خوف کہ ہم کہیں گر نہ جائیں، ہمارے لیے چند قدم چلنا بھی مشکل کر دیتا ہے۔

اپنا ہی نام بھول گیا

ٹامس ایلوا ایڈیسن ایک مشہور سائنس دان گزرا ہے۔ ایک دفعہ اس کے مکان کا ٹیکس جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی۔ لیکن وہ اپنے ایک سائنسی تجربے میں الجھا ہوا تھا۔ اسی حالت میں وہ ٹیکس جمع کروانے چل دیا۔ راستے میں بھی اس تجربے کے متعلق سوچتا رہا۔ حتیٰ کہ قطار میں کھڑا بھی اس کے متعلق سوچتا رہا اور جب اس کی باری آئی تو کلرک نے اس کا نام پوچھا۔ کچھ دیر وہ کھڑکی کے آگے خاموش کھڑا رہا اور بغیر ٹیکس جمع کروائے قطار سے نکل آیا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنا نام بھول چکا تھا۔

خون کے تین گروپ

بھارت کے ضلع لدھیانہ کے ایک اسکول میں حکومت کی طرف سے کیمپ لگایا گیا جس میں طلبہ اور لوگوں کو خون کے عطیے دینے کی ترغیب دی جا رہی تھی۔ اس میں انتقال خون کے عملی مظاہرے اور فوائد بھی دکھائے جا رہے تھے۔ اسکول کا ایک طالب علم اتنا متاثر ہوا کہ وہ مریضوں کو خون دینے کے لیے بے تاب ہونے لگا۔ بارہ چودہ دنوں کے دوران میں اس نے تین مریضوں کو اپنا خون دیا۔ ہر بار اسے سرٹی فیکٹ دیا گیا کہ اس لڑکے نے خون کا عطیہ دیا ہے۔ ہر سرٹیفیکٹ پر اس کے خون کا گروپ لکھا گیا تھا۔

لڑکے نے بڑے فخر سے یہ سرٹیفکٹ اپنے ایک استاد کو دکھائے استاد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہر سرٹی فیکٹ پر لڑکے کے خون کا گروپ مختلف لکھا ہوا تھا۔ یعنی ایک ہی خون کے تین مختلف گروپ۔ استاد اور وہ لڑکا ان مریضوں کے متعلق سوچنے لگے جنہیں یہ خون دیا گیا تھا (روزنامہ پرتاب" جنوری 1991)

سب سے بڑا فرار

یہ فروری 1979ء کا ایک دن تھا۔ ایران کے شہر تہران کی جیل میں قیدی مشقت میں مصروف تھے۔ ان میں دو قیدی امریکی تھے۔ ان دو قیدیوں کو فرار کرانے کے لیے امریکی فوج کا کرنل آرتھر سائمن جو "بل" کے نام سے مشہور ہے، چودہ تجربہ کار کمانڈو جوانوں کے ساتھ بڑے ہی دلیرانہ اور ڈرامائی طریقے سے جیل میں داخل ہوا اور جیل کے دروازے کے محافظوں پر قابو پا کر دروازہ کھول دیا۔ دونوں قیدیوں کو فرار کرا لیا گیا۔ جب دوسرے قیدیوں نے دروازہ کھلا ہوا اور محافظوں کو بے بس دیکھا تو سب دوڑ پڑے۔ اس طرح چند منٹوں میں گیارہ سو قیدی جیل سے فرار ہو گئے۔

کھالو نامُرادو!

شہناز خان

جنگل کی رات بڑی ڈراؤنی ہوتی ہے کیوں کہ درندے رات کو شکار کے لیے نکلتے ہیں۔ شیر اور چیتے دن کے وقت مارا ہوا شکار رات کو آرام سے کھاتے ہیں۔ جب ساری دنیا سو جاتی ہے تو جنگل جاگ اٹھتا ہے۔ کوئی انسان جنگل میں جانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ لیکن بعض جنگلوں میں اکثر انسانی قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ جیسے چند بے فکرے اور زندہ دل انسان موت سے بے پروا جنگل میں بیٹھے لطیفے سن اور سنا رہے ہوں۔ پہلے پہل جب شکاری افریقہ کے جنگلوں میں گئے تھے تو ان میں سے کئی شکاری یہ دیکھنے کے لیے کہ رات کے وقت جنگل میں کون لوگ قہقہے لگا رہے ہیں، جنگل میں نکل گئے۔ پھر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ وہ ان قہقہوں کی نذر ہو گئے۔ یہ قہقہے لکڑ بگے کے ہوتے ہیں۔ یہ گیدڑوں کی طرح چیختا، بھیڑیوں کی طرح بھونکتا یا شیروں کی طرح گرجتا نہیں۔ بلکہ انسانوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے۔

اگر آپ چڑیا گھر جائیں تو وہاں آپ کو ایک جگہ ایک تختی پر "چرخ" لکھا نظر آئے گا اس کے ساتھ "لکڑ بگا" بھی لکھا ہو گا یہ آپ کو سلاخوں کے پیچھے گھٹیا نسل کے آوارہ کتے کی طرح لگے گا۔ رنگ سیاہی مائل اور پھیکا پھیکا، شکل بھدی سی، جسم پر کالے کالے دھبے ہوں گے۔ اس کی شکل و صورت سے آپ کو ذرہ برابر شبہ نہیں ہو گا کہ یہ کوئی درندہ ہے۔ یہ عموماً سر نیچے کیے رکھتا ہے۔ جیسے آپ کو دیکھ کر ڈر گیا ہو لیکن یہ ایک درندہ ہے اور درندہ بھی ایسا جو شیر سے اس کا شکار چھین لیتا ہے اور اسے بھگا دیتا ہے۔ جنگلی بھینسے تک کو مار گراتا ہے۔ زیبرا اس کا مرغوب شکار ہے۔ اسے انگریزی میں HYENA، اردو میں "چرخ" یا لکڑ بگا کہتے ہیں۔ یہ بھیڑیے اور کتے کے درمیان کا درندہ ہے۔ لیکن بھیڑیے کے بجائے کتا زیادہ لگتا ہے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ وزن ڈیڑھ من کے قریب ہوتا ہے۔ مادہ کا وزن زیادہ اور نر کا خاصا کم ہوتا ہے۔ مادہ کو قدرت نے نر کی نسبت

زیادہ وزن اور طاقت دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے اپنے بچوں کو ان کے باپ سے بچانا ہوتا ہے۔ نر عام حالات میں اپنے بچوں کو نہیں کھاتا۔ لیکن اگر بھوک پریشان کرے اور کوئی شکار نہ ملے تو اپنا بچہ کھانے سے بھی نہیں چوکتا۔

لکڑبگا 40 میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑتا ہے۔ دوڑ میں صرف ہرن ایک ایسا جانور ہے جو اسے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن لکڑبگا ہرن کے پیچھے دوڑ پڑے تو ہرن اس سے بچ نہیں سکتا۔ کیوں کہ لکڑبگا اتنی دور تک مسلسل دوڑتا چلا جاتا ہے جہاں تک جنگل کا کوئی بھی درندہ یا جانور نہیں دوڑ سکتا۔ ہرن دوڑتے دوڑتے آخرکار تھک جاتا ہے اور اس کی رفتار سست ہوتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں لکڑبگا نہیں تھکتا۔ بلکہ ہرن کو تھکا کر اسے پکڑ لیتا ہے۔ لکڑبگا اگر تن درست رہے تو اس کی زیادہ سے زیادہ عمر پچیس سال ہوتی ہے۔

یہ درندہ اپنے گروہ کے ساتھ رہتا ہے۔ گروہ پر حکم رانی مادہ کی ہوتی ہے۔ نر کو وہ بچوں کے قریب نہیں آنے دیتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نر ایک گروہ سے نکل کر دوسرے میں چلے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کی تمام مادائیں ایک ہی جگہ بچے دیتی اور انہیں پالتی ہیں۔ دو سال تک مائیں بچوں کو اپنے سے الگ نہیں ہونے دیتیں۔ اس وقت تک بچوں کا رنگ سیاہ کالا رہتا ہے۔ دو سال بعد ان کا رنگ بھورا ہونے لگتا ہے۔ اس وقت تک مائیں بچوں کو سر سے دم تک چاٹتی رہتی ہے۔ انہیں منہ میں پکڑ کر پانی میں ڈبوتی اور زیادہ سے زیادہ دیر تک دھوپ میں رکھتی ہیں۔ درندوں کی نفسیات سمجھنے والوں کا کہنا ہے کہ مائیں بچوں کا کالا رنگ دھونے کی کوششیں کرتی ہیں۔ دو سال بعد جب بچوں کا رنگ قدرتی طور پر بھورا ہونے لگتا ہے تو مائیں انہیں چاٹنا اور دھونا چھوڑ دیتی ہیں۔ وہ یہی سمجھتی ہیں کہ ان کے چاٹنے اور دھونے سے بچوں کا رنگ بھورا ہوا ہے۔ حال آں کہ دو سال بعد یہ قدرتی طور پر بھورا ہو جاتا ہے۔

مشاہدات کے مطابق' یہ درندہ گروہ کی صورت میں شکار کھیلتا ہے اور ہر گروہ کا اپنا اپنا علاقہ ہوتا ہے۔ ہنس کروک اور ہیوگو لاوک مشہور شکاری ہیں وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے محفوظ گاڑیوں میں جنگل میں گھوم پھر کر دور بین سے بھی اور قریب سے بھی دیکھا ہے اور راتوں کو تیز روشنی والی بڑی ٹارچوں سے بھی مشاہدات کئے ہیں۔ اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لکڑ بگے شکار مار کر اطمینان سے کھاتے ہیں۔ شکار کی ایک ہڈی بھی نہیں رہنے دیتے۔ صرف خون رہ جاتا ہے۔ ہاں البتہ صرف ایک بار ان محققوں نے لکڑبگوں کے دو گروہوں کی خون ریز جنگ دیکھی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک گروہ شکار کے پیچھے دوڑتا دوسرے گروہ کے علاقے میں چلا گیا تھا۔

واقعہ یوں ہوا کہ کوئی ایک سو کے قریب زیبرے اکٹھے جا رہے تھے۔ آگے صرف ایک لکڑبگا کھڑا تھا۔ اس نے قہقہ لگایا تو چار لکڑ بگے اس کے پاس آ گئے۔ انہوں نے مل کر قہقہے لگائے تو نہ جانے کہاں سے پندرہ سولہ لکڑ بگے اکٹھے ہو گئے۔ وہ آوارہ کتوں کی طرح ادھر ادھر گھومنے پھرنے لگے جیسے زیبروں کے اتنے بڑے ریوڑ کے ساتھ انہیں کوئی دل چسپی نہ ہو۔ زیبرے دلکی چال چلتے ان کے قریب سے گزرتے رہے اور لکڑ بگے یوں بدک بدک کر ان کے راستے سے ہٹتے رہے جیسے کتا گھوڑے سے بدک کر پرے ہٹ جاتا ہے۔ زیبرے ان کے قریب سے گزر گئے۔ جوں ہی ریوڑ کا آخری زیبرا گزرا' لکڑ بگے ریوڑ پر ٹوٹ پڑے۔

زیبرے سرپٹ دوڑ پڑے۔ زیبرے کی رفتار گھوڑے جتنی ہوتی ہے اور طاقت میں بھی یہ جانور گھوڑے سے کم نہیں ہوتا۔ ان کی رفتار مزید تیز ہوئی تو لکڑ بگے بھی تیز ہو گئے۔ سارا ریوڑ اکٹھا ہو کر اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے زیبرے ایک دوسرے سے چپک کر ایک ہو گئے ہوں۔ لکڑ بگے ان کے پیچھے دائیں بائیں دوڑ رہے تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ کسی ایک زیبرے کو ریوڑ سے الگ کر دیں۔ جب کہ زیبرے اس کوشش میں تھے کہ ان کا کوئی ساتھی ریوڑ سے

الگ نہ ہو۔ کھلا میدان تھا' ریوڑ گھوم گیا۔ لکڑ بگے بھی گھومے۔ اب دونوں گروہوں کی رفتار بہت ہی تیز ہو گئی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے تعاقب کے بعد ایک زیبرا ریوڑ سے الگ ہونے لگا۔ چار پانچ لکڑ بگے پینترا بدل کر اس کے اور ریوڑ کے درمیان ہو گئے اور اچھل اچھل کر اس کے پہلو سے اس کے منہ پر پنجے مارنے لگے اور بدقسمت زیبرا جو اپنے گروہ سے الگ ہو گیا تھا' بالکل ہی اکیلا رہ گیا۔ تمام کے تمام لکڑ بگے اس کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ دو نے اچھل کر اس کی گردن دانتوں میں لے لی۔ دو اس کی پیٹھ پر سوار ہو گئے اور تھوڑی سی اچھل کود کے بعد زیبرا گر پڑا۔ زیبروں کا ریوڑ میدان سے بھاگتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔

لکڑ بگے مارے ہوئے زیبرے کو کھانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ اسی میدان میں ایک بارہ سنگھا سرپٹ بھاگتا نظر آیا۔ اس کے پیچھے پندرہ سولہ لکڑ بگے دوڑے آ رہے تھے۔ یہ کوئی دوسرا گروہ تھا۔ پہلا گروہ جس نے زیبرے کو مارا تھا' زیبرے کو چھوڑ کر چوکس ہو گیا۔ فوراً ہی سارے کا سارا گروہ بارہ سنگھے کے پیچھے دوڑتے لکڑبگوں کی طرف دوڑا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ گروہ بھی بارہ سنگھے کے پیچھے گیا ہے۔ لیکن اس نے بارہ سنگھے کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ اس کے تعاقب میں آنے والے گروہ نے تعاقب ترک کر دیا اور اپنی طرف آتے ہوئے گروہ کے مقابلے کے لیے اپنی ترتیب بدل دی۔ اس کے بعد دونوں گروہوں میں بڑی سخت جنگ ہوئی۔ بارہ سنگھا نکل گیا اور لکڑ بگے لڑتے رہے۔ آدھ گھنٹا تک بہت خون ریز جنگ ہوئی۔ آخر وہ گروہ جو بارہ سنگھے کے پیچھے آیا تھا' ایک ایک کر کے بھاگنے لگا۔ تحقیق کرنے والوں نے دور بینوں سے دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ ہر ایک کا خون بہ رہا تھا۔ زیبرے والے گروہ کی حالت بھی ایسی ہو گئی تھی۔ تاہم اس نے دوسرے گروہ کو اپنی سرحد سے نکال دیا تھا۔ یہ گروہ واپس آگیا اور زیبرے کو کھانے لگا۔ وہاں کے مقامی لوگوں نے بتایا کہ ہر گروہ کا اپنا علاقہ ہوتا ہے۔ لکڑ بگے سرحدوں کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ یہ بارہ سنگھے کے پیچھے دوسرے گروہ کی سرحد میں آگئے تھے۔ ورنہ لکڑ بگے ایسی غلطی نہیں کیا کرتے اور اگر کر بیٹھیں تو دوسرا گروہ اسے معاف نہیں کرتا۔

یہ کہنا بے بنیاد سا لگتا ہے کہ لکڑ بگے شیر سے شکار چھین کر کھا لیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کا مشاہدہ انہی دو شکاریوں نے کیا تھا جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ایک ببر شیر نے ایک بھینسا مارا تھا۔ وہ اسے کھانے بیٹھا تو پانچ لکڑ بگے آگئے۔ ایک نے پیچھے سے دبے پاؤں جا کر شیر کی دم کو دانتوں سے کاٹا۔ شیر غرا کر اٹھا اور اس کی طرف دوڑا۔ لکڑ بگا تیزی سے دور چلا گیا۔ پیچھے ایک اور لکڑ بگا دوڑتا آیا اور شیر کی دم پر دانت مار کر دوسری طرف بھاگ گیا۔ شیر رک گیا اور جب اس نے اپنے شکار کو دیکھا تو وہاں تین لکڑ بگے بھینسے کو مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔

شیر غصے سے ان کی طرف دوڑا تو وہ تینوں بھاگ گئے۔ شیر کھانے پر بیٹھ گیا۔ پیچھے سے ایک لکڑ بگا آیا اور اس کی دم پر دانت مار کر بھاگ گیا۔ شیر اس کی طرف دوڑا۔ ایک اور لکڑ بگا پیچھے سے اسے چھیڑ کر دوسری طرف بھاگ گیا۔ شیر مڑ گیا اور پھر اپنے شکار کی طرف دوڑا۔ جسے تین لکڑ بگے کھا رہے تھے۔ شیر ایک بار پھر کھانے پر بیٹھ گیا۔ لکڑبگوں نے اس پر ایک بار پھر پہلے والا عمل دہرایا۔ اس طرح کی چھیڑ خانی جاری رکھ کر لکڑ بگوں نے شیر کا وہ حشر کر دیا کہ اس نے پریشان ہو کر اپنے شکار کو دیکھا اور پھر اپنے اردگرد دور دور پانچ لکڑبگوں کو دیکھا اور آہستہ سے یوں غرا کر چلا گیا جیسے اس نے جھنجلا کر کہا ہو۔ ''کھالو نامرادو! تم ہی کھالو میں چلا جاتا ہوں''۔

وہ چلا گیا اور لکڑبگوں نے قہقہے لگا کر اپنے پورے گروہ کو بلا لیا۔ تھوڑی دیر بعد اتنا موٹا تازہ بھینسا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہاں اس کے صرف چار پاؤں اور خون رہ گیا۔ یہ مشاہدہ تو اکثر کیا گیا کہ جس جنگل میں لکڑ بگے ہوتے ہیں وہاں شیر جنگل کی بادشاہی کا دعوئ نہیں کر سکتا۔ لکڑ بگے اکثر اس کا مارا ہوا شکار کھا جاتے ہیں۔ البتہ شیر دو ہوں تو

لکڑ بگے ان کے قریب نہیں جاتے۔ کیوں کہ دوسرے شیر کی موجودگی میں ان کا چھیڑ خانی والا حربہ کام یاب نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر بھیڑیے، گیدڑ اور اودھ بلاؤ وغیرہ جیسے چھوٹے گوشت خور جانور شیروں کے شکار کا بچا کھچا کھاتے اور زندہ رہتے ہیں۔ لکڑ بگا واحد چھوٹا درندہ ہے جو شیر کا پورا شکار کھالیتا ہے اور وہ بھی چھین کر۔

جنگل میں رہنے والے انسان درندوں میں رہ کر زندہ رہتے ہیں۔ وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس بے بسی کی وجہ سے وہ عجیب و غریب توہمات کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ یہ لوگ شکاریوں سے لکڑ بگے کی کھال کا دو چار انچ ٹکڑا مانگتے ہیں۔ اگر کوئی مرا ہوا لکڑ بگا مل جائے تو اس کی کھال کئی لوگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ کھال کے ٹکڑے کو یہ لوگ خشک کر کے پیستے ہیں اور چارے میں ملا کر اپنے مویشیوں کو کھلا دیتے ہیں۔ وہ پورے یقین سے کہتے ہیں کہ جس مویشی نے لکڑ بگے کی کھال کھائی ہو۔ اس پر لکڑ بگے حملہ نہیں کرتے۔ ظاہر ہے یہ صرف ان کی توہم پرستی ہے۔

حبشہ میں ایک گاؤں ایسا بھی ہے جہاں لکڑ بگے وہاں کے رہنے والوں کے ساتھ گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ اس گاؤں میں ہر سال ایک گائے لکڑ بگوں کو نذرانے کے طور پر دی جاتی ہے۔ یہ گاؤں مکمل طور پر صاف ستھرا رہتا ہے۔ لکڑ بگے گلیوں میں کوئی چیز نہیں رہنے دیتے۔ یہ دوستی عجیب سی لگتی ہے۔ یہ لکڑ بگے جنگل میں جا کر شیر کو بھی خاطر میں نہیں لاتے مگر گاؤں میں آتے ہیں تو گاؤں والوں کے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہیں کہ کچھ کھانے کو مل جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس درندے کی نفسیات دوسرے درندوں سے بہت مختلف ہے۔ اس میں خوبیاں یہ ہیں کہ لالچی نہیں۔ اپنے گروہ میں اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہتا ہے اور نظم و ضبط کا پابند رہتا ہے۔ جان بوجھ کر سرحدی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اتحاد اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس خوبی کی بدولت وہ شیر سے شکار چھین کر اسے بھگا دیتا ہے۔

دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے

محمد عمر سلیم

بچوں کے بہت سارے مسائل ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس مہنگائی کی زد میں آگئے ہیں۔

اب دیکھیے نا کچھ ہی کھیل ایسے ہیں جو بچوں کو اچھے لگتے ہیں اور انھیں کھیلنے آتے ہیں مثلاً کرکٹ' فٹ بال' بیڈمنٹن' اسکوائش' بیس بال وغیرہ لیکن ان سب میں ہی پیسا خرچ ہوتا ہے۔ اول تو ہر بچے کے گھر کے پاس کھیل کے میدان نہیں جن کی وجہ سے انھیں مجبوراً اپنے گھروں کے سامنے گلیوں اور سڑکوں پر ہی کھیلنا پڑتا ہے۔ دوسرا کھیلوں کی چیزیں ہی اتنی مہنگی ہو گئی ہیں کہ وہ گھر والے بڑی مشکل سے لے کر دیتے ہیں۔ کرکٹ کی صرف ایک گیند لینے کے لیے بچوں کو اپنے بڑوں کی کئی شرائط پوری کرنی پڑتی ہیں اور پھر خرید دیے جانے کے بعد اس پر پندرہ روپے کی ٹیپ چڑھا کر جب بچے گلیوں میں کھیلنے نکلتے ہیں تو جس کے گھر بھی جاتی ہے یا تو وہ گیند ہی واپس نہیں دیتے یا ڈانٹ ڈپٹ کے بعد دیتے ہیں۔ تو پیارے بچو! میں نے سوچا کہ کھیلنا تو سب بچوں کا حق ہے! کیوں نہ ہم کچھ ایسے کھیل آپ کو سکھائیں جن میں پیسے بھی خرچ نہ ہوں اور گلیوں میں بھی نہ کھیلنا پڑیں۔

واہ جمورا

اس کھیل کو تین یا تین سے زیادہ بچے کھیل سکتے ہیں۔ اس کھیل میں ایک بچہ مداری بنے گا اور دوسرا بچہ جمورا باقی سب بچے تماشائی ہوں گے۔ مداری جمورے کو پہلے یہ سکھا دے گا کہ وہ آنکھیں بند کر کے مداری کی طرف سے منہ پھیر کر ذرا دور کھڑا ہو جائے۔

کھیل نمبر 1 واہ جمورا

اب مداری بچہ باقی بچوں سے کہے گا "تم کسی چیز کا نام میرے کان میں بتا دو' میں جمورے سے بہت سارے لفظ پوچھوں گا' اس لفظ کے آتے ہی جمورا محفل کو بتا دے گا کہ یہ لفظ پوچھا گیا ہے"۔

محفل میں سے کوئی بھی بچہ مداری کے کان میں کوئی بھی لفظ کہے گا' مداری جمورے سے بہت سارے لفظ پوچھے گا۔ جیسے ہی جمورے کے کان کو بتایا ہوا لفظ سنائی دے گا وہ فوراً بتا دے گا جس سے حاضرین حیران رہ جائیں گے اور یہ اعتراض کریں گے۔

1۔ مخصوص لفظ مقررہ الفاظ کی تعداد کے بعد پوچھا گیا ہو گا۔

2۔ آنکھ سے اشارہ کر دیا ہو گا۔

تو دوستو ان اعتراضات کے لیے آپ ساتھی بچوں سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ چیز کا نام اور الفاظ کی تعداد اپنی مرضی سے ایک چٹ پر لکھ کر دیں جمورا پھر بھی بوجھ لے گا۔

یہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ

پہلے سے جمورے کے ساتھ مداری حروف تہجی کا یعنی ا' ب کا کوئی لفظ بھی طے کر لیتا ہے یعنی حاضرین جو لفظ پوچھیں مداری اس لفظ سے پہلے کوئی بھی ایسا لفظ ضرور بولے گا جو الف سے شروع ہو' جیسے حاضرین نے مداری سے کہا کہ وہ لفظ میز پانچ لفظوں کے بعد بولے۔ تو مداری اسے پوچھے گا۔ ٹماٹر جمورا کہے گا نہیں' مداری پوچھے گا گاجر۔ بچہ جمورا کہے گا نہیں۔ مداری پوچھے گا جوتے' جمورا کہے گا نہیں۔ مداری پوچھے گا انگور۔ جمورا کہے گا نہیں۔ اب پانچواں لفظ الف کے ساتھ پوچھنے کے بعد مداری پوچھے گا میز یعنی اصل لفظ پوچھے گا جس پر جمورا "جی" کہے گا چوں کہ اس سے پہلے ایک لفظ الف سے شروع ہونے والا آنا ضروری تھا اب ظاہر ہے کہ بچے جمورے کو صحیح جواب دینے کے لیے کسی ہاتھ کے اشارے کی ضرورت نہیں تھی لہٰذا اس نے بغیر دیکھے آنکھیں بند کئے ہوئے جی کہہ دیا۔

اونچ نیچ

اس کھیل کے لیے کسی برآمدے یا لان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں کچھ چیزیں اونچی ہوں مثلاً سیڑھیاں' کچھ اینٹیں' چھوٹی چھوٹی مٹی کی پہاڑیاں' چوکیاں وغیرہ۔ اس

کھیل کی ابتدا پگنے (ٹاس کرنے) سے ہوتی ہے۔ آخر میں جو بچہ پگنے سے رہ جاتا ہے۔ وہ چور بن جاتا ہے اور باقی بچے اونچی نیچی چیزوں پر بھاگ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کھیل شروع ہوتا ہے۔ چور بچہ زمین پر کھڑا ہو کر سب بچوں کا محتاط جائزہ لیتا ہے اور تاک میں رہتا ہے کہ کون سا بچہ اپنی

کپتان۔ دونوں ٹیمیں تصویر کے مطابق لائن میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ جاتی ہیں۔ پھر ٹاس ہوتا ہے جو کپتان ٹاس جیتتا ہے وہ اس کھیل کا آغاز کرتا ہے۔ ٹیم اے کا کپتان ایک چھوٹا سا پتھر لیتا ہے۔ اور پتھر کو اپنی مٹھی میں چھپا کر ہاتھ سب کی گودی میں ایسے کرتا ہے

کھیل نمبر 3 امین کون؟

اپنی اونچی جگہ سے اترے اور وہ اسے پکڑ کر اسے چور بنا دے۔

اونچی جگہوں پر کھڑے ہوئے بچے ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہیں اور بھاگ کر ایک دوسرے سے جگہیں بدل لیتے ہیں۔ یہ خیال رکھتے ہوئے کہ چور ان میں سے کسی کو بھاگ کر نہ پکڑ لے۔ کیوں کہ جگہ بدلتے ہوئے جو بھی بچہ چور کی سطح پر پکڑا جائے گا وہ چور بن جائے گا اور چور بھاگ کر اس کی جگہ لے لے گا۔ اور یوں یہ کھیل بچے جتنی دیر چاہیں جاری رکھ سکتے ہیں۔

امین کون؟

یہ کھیل بچوں کے چہروں پر تاثرات پڑھنے کا ہے۔ آپ خود سوچیے کہ چہرے پر تاثرات پڑھنا کتنی بڑی ذہنی آزمائش ہے۔ اس کھیل میں دو ٹیمیں بن جاتی ہیں اور دو

جیسے پتھر اس کے پاس چھپا رہا ہو اور اس کے تمام ساتھی اپنے چہرے سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پتھر ان کے پاس چھپا ہوا ہے۔ اب وہ ٹیم بی کے کپتان کو بلاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ امین کون ہے۔ ٹیم بی کا کپتان ٹیم اے کے ساتھیوں کے چہروں سے اندازہ لگاتا ہے کہ پتھر کس کے پاس چھپا ہو گا اور پھر وہ کسی کا نام لے دیتا ہے اگر پتھر اس کے پاس سے نکلے تو ٹیم بی کی باری آجاتی ہے اور اگر نہ نکلے تو جس کے پاس پتھر ہو وہ سامنے کی طرف تصویر کے مطابق جس حد تک ہو سکتا ہے ایک لمبی چھلانگ لگاتا ہے۔ ٹیم اے کا کپتان دوبارہ پتھر چھپاتا ہے۔ اس طرح یہ کھیل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک دوسری ٹیم کی باری نہ آجائے یا ٹیم کے سارے کھلاڑی لانگ جمپ لگا لگا کر ٹیم بی کی لائن پر نہ پہنچ جائیں جو ٹیم پہلے اپنی مخالف ٹیم کی لائن پر پہنچ جائے گی وہ جیت جائے گی۔

ابن الطاف

کھیلوں کی دنیا

ون ڈے میں سنچری میکر

بھارت کے شہر مدراس کے کرکٹ اسٹیڈیم میں پاکستان اور بھارت کے درمیان آزادی کپ کا ابتدائی لیگ میچ ہو رہا ہے۔ پاکستان کے اوپن انگ بلے باز سعید انور نے بھارتی بالرز کو وکٹ کے چاروں طرف خوب صورت اسٹروک کھیل کر پریشان کر رکھا ہے۔ سعید انور کا بلا چاروں طرف گھوم رہا ہے۔ پاکستانی ناظرین کا شوق دیدنی ہے اور بھارتی تماشائیوں کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔

بھارت کے تجربہ کار لیگ اسپنر انیل کمبلے کے ایک اوور میں سعید انور نے لگاتار تین چھکے اور ایک چوکا لگا کر مجموعی طور پر ایک اوور میں 26 رنز بنا دیئے۔ ناظرین کے پاکستان زندہ باد' سعید انور پائندہ باد کے فلک شگاف نعروں نے ایک بار پھر بھارت پر اپنی ابدی برتری کا اعلان کر دیا۔ اس میچ میں سعید انور نے 194 رنز بنا کر ون ڈے کرکٹ میں سب سے زیادہ انفرادی اسکور کرنے کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ اس سے پہلے یہ ریکارڈ ویسٹ انڈیز کے ویون رچرڈ کے پاس تھا۔ اس نے 1984 میں انگلینڈ کے خلاف کھیلتے ہوئے 189 رنز بنائے تھے مگر سعید انور نے پانچ چھکوں اور بائیس چوکوں کی مدد سے 194 رنز بنا کر نہ صرف عالمی ریکارڈ قائم کیا بلکہ پانچ رنز کی شان دار برتری بھی حاصل کی۔ وہ سارا وقت بھارتی بالروں پر چھائے رہے۔ اس میچ میں پاکستان نے پہلے بیٹنگ کرتے ہوئے 327 رنز بنائے جب کہ بھارتی ٹیم 292 رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ اس طرح پاکستان نے یہ میچ 35 رنز کی برتری سے جیت لیا۔ اس میچ میں سعید انور نے دو عالمی ریکارڈ قائم کیے۔ پہلا 194 رنز کا اور دوسرا ون ڈے میں سب سے زیادہ 22 چوکے لگانے کا۔

پاکستان کے مایہ ناز کھلاڑی سعید انور 6 ستمبر 1968ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ یوم دفاع کے دن آنکھ کھولنے والے اس شیر دل جوان نے اس میچ میں بھارت کو بتا دیا کہ پاکستانی ہر میدان میں جیتنے کے داؤ پیچ جانتے اور مہارت رکھتے ہیں۔ بائیں ہاتھ کے افتتاحی بلے باز اور اسپن بالر کی حیثیت سے آپ نے 87-1986ء میں اپنے فرسٹ کلاس کیریر کا آغاز کیا جب کہ 1989ء میں ایک روزہ انٹرنیشنل کیریر کا آغاز کیا اور ایک ایسے بلے باز کی حیثیت سے متعارف ہوئے جو گیند کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی تمنا رکھتا تھا۔ سعید انور اب تک ایک روزہ انٹرنیشنل میں 153 میچوں کی 151 اننگز میں 15 سنچریاں بنا چکے ہیں اور ایک روزہ انٹرنیشنل میں سب سے زیادہ سنچریاں بنانے والے دوسرے بلے باز ہیں۔ اس سے پہلے سب سے زیادہ سنچریاں بنانے والے ویسٹ انڈیز کے ڈیسمنڈ ہینز تھے جنھوں نے 17 سنچریاں بنائی تھیں مگر ان کا یہ ریکارڈ بھارت کے ٹنڈولکر نے 1998ء

نے آزادی کپ میں سری لنکا کے خلاف 17 سنچریاں بنا برابر کر دیا۔

سعید انور کو ریکارڈ توڑنے یا برابر کرنے میں دو یا تین سنچریاں درکار ہیں جو قوی امید ہے کہ 12 ستمبر 1998ء سے شروع ہونے والے صحارا کپ میں بن جائیں گی۔ اس سلسلہ میں سب پاکستانیوں کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

بائیں ہاتھ سے خوب صورت اسٹروکس کھیلنے والے

سعید انور کو مسلسل تین سنچریاں بنانے کا اعزاز بھی حاصل ہے انہوں نے شارجہ کے مقام پر شارجہ چیمپیئنز ٹرافی میں 30 اکتوبر 1993ء کو سری لنکا کے خلاف 107 رنز' یکم نومبر 1993ء کو ویسٹ انڈیز کے خلاف 131 رنز اور 2 نومبر 1993ء کو سری لنکا کے خلاف 111 رنز بنا کر مسلسل تین سنچریاں بنانے کا ظہیر عباس کا ریکارڈ برابر کیا۔

سعید انور نے سری لنکا کے خلاف 6' بھارت کے خلاف 3' ویسٹ انڈیز اور نیوزی لینڈ کے خلاف دو دو جب کہ آسٹریلیا کے اور زمبابوے کے خلاف ایک ایک سنچری بنائی۔ سعید انور کو پاکستان کی جانب سے ایک روزہ مقابلوں میں پچاسویں سنچری بنانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

اس عظیم بلے باز نے ایک روزہ میچوں کی تاریخ کے 286ویں میچ میں ناٹ آؤٹ رہتے ہوئے آسٹریلیا کے خلاف 119 گیندوں پر تیرہ چوکوں اور ایک چھکے کی مدد سے 104 رنز بنائے۔ سعید انور کو ایک روزہ میچوں کی 110 ویں سنچری بنانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ جو انہوں نے سری لنکا کے خلاف 17 فروری 1990ء کو بنائی۔ اس قابل فخر پاکستانی بلے باز نے اپنی پندرہ سنچریوں میں سے 12 سنچریاں پاکستان سے باہر بنائیں۔ جن میں سے سات شارجہ کے مقام پر بنائیں۔ سعید انور نے 14 بار ناٹ آؤٹ رہتے ہوئے مجموعی طور پر 5551 رنز بنائے ہیں۔ انہوں نے ون ڈے میں 24 نصف سنچریاں بھی اسکور کی ہیں۔ ان کی اوسط 40.50 رنز فی اننگز ہیں۔

سعید انور اب تک اپنی عمر کی 30 سیڑھیاں عبور کر چکے ہیں۔ مگر پاکستان کو عالمی سطح پر متعارف کرانے میں بہت سارے اہل وطن سے آگے نکل گئے ہیں اور کرکٹ کے لاکھوں شیدائیوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سعید انور کا پورٹریٹ دیکھتے ہی یہ مصرع منہ میں گنگنانا شروع کر دیتے ہیں "ہم ہیں پاکستانی' ہر میدان میں' ہر طوفان میں جیتیں گے"۔ ان شاءاللہ

☆ ☆ ☆

خالی جگہ پر کیجئے۔

یہ جملے اسی شمارے میں چھپی ہوئی عبارت سے لیے گئے ہیں۔

1۔ تم لوگوں کو ...... میں نہیں پڑنا چاہیے۔

2۔ اگر ...... چور تھا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟

3۔ ...... منظر نظر میں گھومتے ہیں۔

4۔ خبردار! آج سے ہمارے ہاں کوئی ...... نہ اڑے۔

5۔ ...... اب تک اپنی عمر کی 30 سیڑھیاں عبور کر چکے ہیں۔

6۔ اب ...... بھی جہازوں میں سفر کرنے لگے۔

7۔ اگر دنیا میں کسی بھی جگہ کوئی ...... ہو تو وہ چھپا نہیں رہ سکتا۔

8۔ میں قانون اور اپنے ضمیر کے مطابق ...... کی تلاش میں ہوں صاحب!

9۔ اندر ایک لڑکا ...... پر نیم بے ہوش پڑا تھا۔

10۔ اس لیے ...... میں خود بخود لچک آگئی۔

ایک سے زائد اور سات سے کم درست حل موصول ہونے کی صورت میں انعامات مساوی مالیت میں دیئے جائیں گے۔ سات یا سات سے زیادہ درست حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا اور چھ انعام بالترتیب 100، 90، 80، 70، 60 اور 50 روپے کی مالیت کی کتابوں کے دیئے جائیں گے۔

جوابات داؤدی علمی آزمائش ستمبر 1998ء

(1) ترقی (2) کتابوں (3) طیارہ (4) 1899 (5) غلطی (6) طلبہ (7) گلاب کے پھول (8) بزرگ (9) محبت (10) کھدائی

اس ماہ 467 ساتھیوں کے بالکل درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے ان چھ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام دیئے جا رہے ہیں۔

○ پہلا انعام: عائشہ سعید بہاول پور (100 روپے کی کتابیں)

○ دوسرا انعام: مدیحہ ثمن، ریسالہ خورو (90 روپے کی کتابیں)

○ تیسرا انعام: مریم عرفان، لاہور (80 روپے کی کتابیں)

○ چوتھا انعام: احمد رسول بیگ، لاہور (70 روپے کی کتابیں)

○ پانچواں انعام: ثمرین لطیف، لاہور (60 روپے کی کتابیں)

○ چھٹا انعام: رابعہ صدف، جھنگ صدر (50 روپے کی کتابیں)

ان ساتھیوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی شائع کیے جا رہے ہیں:

ملک محمد عمران اختر دریا خان۔ عارف کفایت اللہ خان حیدر آباد۔ محمد سعد امجد راول پنڈی۔ محمد سلمان غفور خان کراچی۔ محمد احسان اوکاڑہ۔ احسان اللہ ہنگو۔ اسوہ سحر ساہیوال۔ محمد عمار ملتان۔ رافع عزیز گوجرانوالہ۔ عروج اعجاز گوجرانوالہ۔ مریم بی بی راول پنڈی۔ فرحان آصف منگل گاہ۔ آمنہ بٹ سیال کوٹ۔ سعدیہ جبیں گوندل تخت کموٹ۔ وقار حسن موان فتح پور شریف۔ حفصہ بانو لاہور۔ اشفاق احمد علی لاہور۔ خاتون زار اکرام لاہور۔ جاوید اقبال تبسم جلال پور پیروالہ۔ عظمیٰ نظیم لاہور۔ محمد عامر ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد مالک چیچہ وطنی۔ عائشہ شفیق احمد گجرات۔ محسن اسماعیل لاہور۔ نظیفہ رشید اوکاڑہ۔ ایاز محمود لاہور۔ غفران بیگ لاہور۔ شائلہ امین گوجرانوالہ۔ ماجد شکیل صدیقی لاہور۔ ارفع فاروقی لاہور۔ فہیم الرحمان سیال کوٹ۔ سیدہ شعلہ ہمدانی کندیاں خاص۔ محمد اسلم لاہور۔ ندیم اقبال رحیم یار خان۔ حافظ سرفراز امیر اوکاڑہ۔ موان احمد لاہور۔ مریم ارشد کوٹ عبدالمالک۔ سید محمد دانش فیصل آباد۔ محمد شکیل احمد کوٹ رادھا کشن۔ محمد ارشد مغل چیچہ وطنی۔ اسد علی ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد بلال حیدر عبدالحکیم۔ ارسلان علی داؤد واہ چھاؤنی۔ ہمایوں عبدالستار فیصل آباد۔ نعمان حامد لاہور۔ سدرہ جہانگیر لاہور۔ سیدہ شان بانو کاظمی لاہور۔ سید محمد علی کاظمی قصور۔ فرخ ابرار ڈیرہ اسماعیل خان۔ احمد علی اسلام آباد۔ نوید اسلم لاہور چھاؤنی۔ ضیغم سرفراز خان اٹک۔ نادیہ خان ہری پور۔ میمونہ فاروق راول پنڈی۔ احمد اسفند یار بزدار ڈیرہ غازی خان۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 17 اکتوبر

دماغ لڑاؤ

نام ____________________

مقام ____________________

پتا ____________________

____

شرارتی لکیریں
شاہد ریاض شاہد
میری عینک تو پکڑا دو
دھندلا دکھائی دے رہا ہے ہاتھ مارتا ہوں
ہم ہیں ان "استادوں" کے استاد!
بیڈ منٹن بھی اور فٹ بال بھی
اوٹ پٹانگ
ردی کی ٹوکری
اے! تمھیں پتنگیں لوٹنے کی پڑی ہے، پہلے یہ بتاؤ ٹکٹ ہے آپ کے پاس؟

اکتوبر آیا رُت بدلی

گئے گرمی کی شدت کے مہینے
ہوئے ہیں خشک اب بہتے پسینے
دن آیا چاہتے ہیں سردیوں کے
لیا ہے سانس سکھ کا ہر کسی نے!!

کبھی سردی، کبھی گرمی کی باتیں
کبھی چھوٹی، کبھی لمبی ہیں راتیں
کوئی گرمی کوئی سردی کو چاہے
غرض، جتنے ہیں منہ اتنی ہی باتیں

کبھی پت جھڑ، کبھی برسات، کیا ہے
ہے ان کے پاس جو سوغات، کیا ہے
ترستے ہیں کبھی اک بوند کو ہم
کبھی پانی کی پھر بہتات کیا ہے

حفیظ الرحمان احسن

عجب منظر نظر میں گھومتے ہیں
انوکھی ہیں حسیں موسم کی گھاتیں

یہ قطرے اوس کے، سبزے کے اوپر
فلک پر ہیں ستاروں کی براتیں

حسیں چادر بچھی ہے کہکشاں کی
ستارے روشنی کا چرخہ کاتیں

کہانی رات دن لکھتی ہے فطرت
قلم ہیں اس کے، اور اس کی دواتیں

ہیں جتنی بھی رتیں، سب ہیں سہانی
سناتی ہیں یہ فطرت کی کہانی

بدلتے موسموں سے ہم نے جانا
ہیں سب موسم خدا کی مہربانی

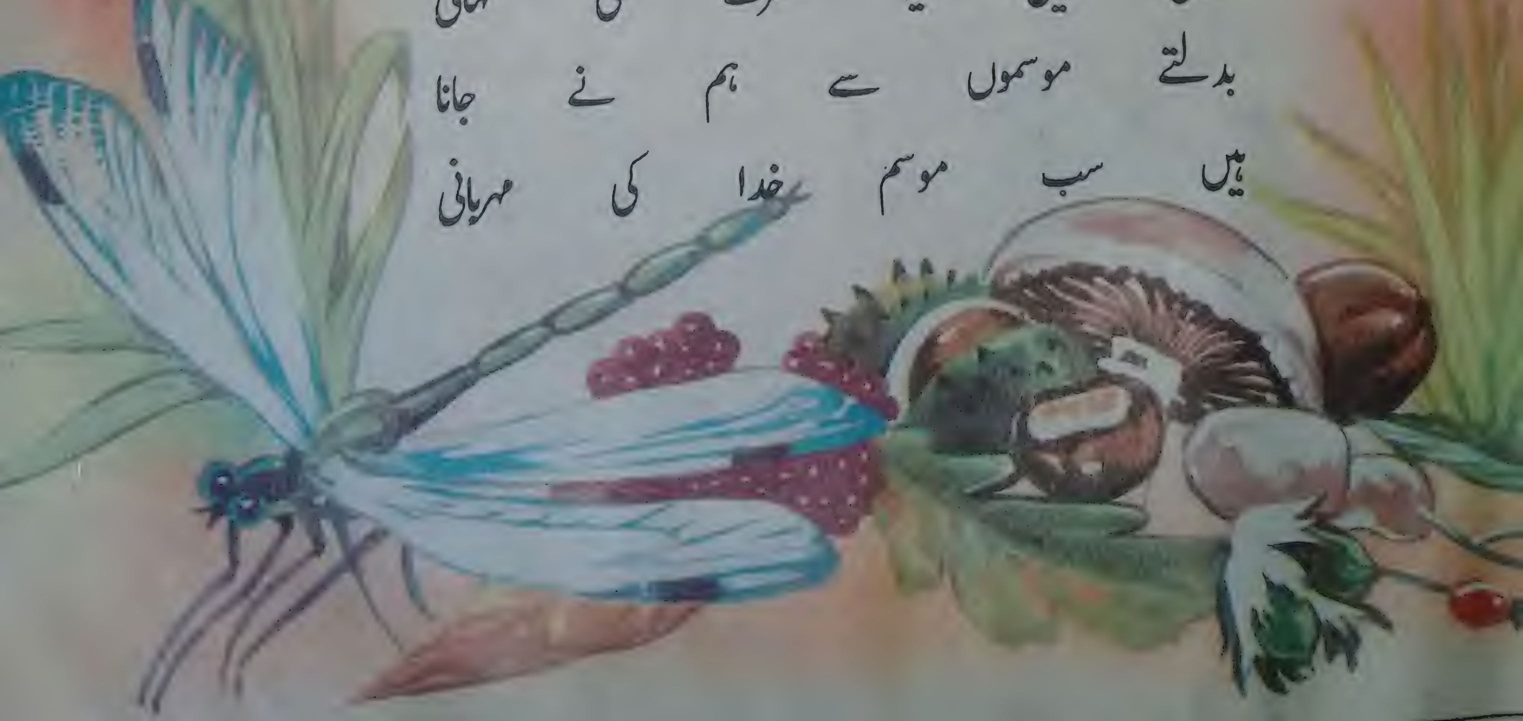

گھونسلا

محیط اسماعیل

اس روز جب میں صبح رسوئی میں پانی پینے گیا۔ تو اگلے ہی لمحے پھڑ پھڑ کی آواز آئی' اوپر نظر گئی۔ ایک چڑا خود کشی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ حیرت ہوئی یہ کیسے ہوا! غور کرنے کا موقع نہیں تھا۔ بے چارہ پتا نہیں کب سے لٹکا ہوا تھا۔ اب فوری طور پر اسے بچانے کی تدبیر سوچنا تھی۔ بڑی بچی کو آواز دی ایک بڑا اسٹول یا کرسی لے آؤ جلدی۔

اسٹول کے ساتھ دوسرے بچے بھی موقع واردات پر پہنچ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے ان کی ماں بھی۔ پھر بہت ساری چڑیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اور حیران ہوا کہ چڑیاں نظر تو نہیں آ رہیں پھر یہ آوازیں کس طرف سے!! دیکھا تو چاروں بچے اور ان کی ماں کے منہ سے افسوس بھری "چ! چ! چ! چ!" ایک ساتھ برآمد ہو رہی تھیں۔

میں نے سب کو ان کے حال پر چھوڑا لیکن چڑے کو اس کے حال پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ فوراً اسٹول پر کھڑا ہوا۔ اب میرا ہاتھ آسانی سے اس تک پہنچ رہا تھا۔ نہیں معلوم کب سے وہ روشن دان میں اپنا گھونسلا بنائے جا رہا تھا۔ اس کے تعمیری سامان میں پتنگ کی الجھی ہوئی ڈور زیادہ تھی۔ کہیں سے چونچ میں گچھا پکڑ لایا ہوگا۔ گھونسلے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہاں نصب ایک کیل میں ڈور کا سرا لپٹ گیا۔

اس قبیل کا پرندہ گھونسلا بناتے وقت تنکا یا دھاگا لاتا ہے تو پہلے ایک آدھ چکر اپنے زیر تعمیر گھونسلے کا لگاتا ہے۔ شاید اس دوران میں طے کرتا ہے کہ لائی ہوئی شے کو گھونسلے کے کس حصے میں شامل کرنا ہے۔ بدقسمتی سے اس کی لائی ہوئی ڈور کا دوسرا سرا اس کے اپنے گلے میں کئی پھندوں کی شکل میں لپٹ گیا تھا اور اسے سانس لینے کے عمل میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ جب اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ تڑپا اور پھڑ پھڑایا۔ آخر کار روشن دان سے پھسل پڑا اور لٹک گیا۔

میں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے ڈور توڑنے کی کوشش کی' لیکن وہ خاصی مضبوط تھی اس لیے ٹوٹنے میں نہیں آ رہی تھی۔ اتنے میں قینچی آ گئی۔ قینچی ہاتھ آتے ہی میں نے سوچ لیا کہ سب سے پہلے کیل سے گلے تک جو ڈور ہے اس کو کاٹ کر چڑے کو تھامنا ہے پھر اس کے گلے سے

دھاگا علیحدہ کیا جائے گا۔

اب میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ چڑا ذرا بھی ہل جل نہیں رہا تھا۔ کہیں دم ہی نہ نکل گیا ہو۔ میں نے جلدی سے اس مضبوط ڈور کو قینچی لگائی۔ نیچے بچوں نے ایک چادر تان رکھی تھی۔ جس طرح فائر بریگیڈ والے آگ لگی عمارتوں کی اوپر والی منزلوں سے کسی کو بچاتے ہیں تو نیچے ایک مضبوط اور بڑا سا جال تان لیتے ہیں۔ پھر مصیبت زدہ اوپر سے کود جاتا ہے اور اگر کم عمر ہو تو اس محکمے کا آدمی اس کے ساتھ نیچے آ رہتا ہے۔

میں نے اپنا بایاں ہاتھ بھی چڑے کو تھامنے کے لیے پھیلا رکھا تھا مگر وہ ڈور سے آزاد ہوتے ہی پھر سے اڑ گیا۔ اس کا یہ رویہ پہلے سے زیادہ حیران کر گیا۔ بچوں نے کیا کیا سوچ رکھا تھا کہ اس متاثرہ چڑے کو آج "وی آئی پی" مہمان کریں گے۔ ہمدردی کے پنجرے میں رکھ کر اسے بتا دیں گے کہ ہم انسان کتنے رحم دل ہوتے ہیں۔

مگر افسوس اس ننھے پرندے نے ہمارے جذبات و اخلاقیات کی چنداں پروا نہیں کی اور "ناشکرے" بندوں کی طرح منہ پھیر کر چلا گیا۔ اس کے رسوئی سے نکلتے ہی ہم لوگ بھی باہر آ گئے۔ نظروں نے تعاقب کیا۔ بے مروت چڑا منڈیر پر جا بیٹھا تھا۔ وہاں وہ اپنی چونچ سے گلے میں لپٹی ڈور کو کھولنے اور جدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا سر دست کام یاب نہ ہوا۔ نہ جانے کیا سوچ کر شاید کسی "ڈور سلجھاؤ ماہر" کا خیال آتے ہی وہاں سے بھی اڑ گیا۔

اس کے بعد ہم رات تک تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے زیر تعمیر گھونسلے کی طرف دیکھتے رہے: نہ کوئی چڑا نہ چڑے کا بچہ۔ اس کی کوئی ساتھی چڑیا بھی نہ دیکھی۔ اس چڑے کو اس پھندے سے پہلے ہم نے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا بھی ہو گا تو ایک عام نظر سے۔

چڑیاں یا چڑے دیکھنے میں سب ایک سے لگتے ہیں۔ کسی کسی میں ذرا صحت کا فرق ہوتا ہے اور بس۔ آزاد ہونے والا چڑا نہ جانے کیوں ہمیں اپنے گھر کا فرد معلوم ہوا تھا۔ ایک ننھا سا فرد۔ مگر وہ بجائے مانوس و ممنون ہونے کے گھر ہی چھوڑ گیا۔ شاید اس خوف سے کہ انسان پرندوں کے ساتھ دو طرح کا سلوک ہی تو کرتے ہیں' قید کر لیتے ہیں یا شکار۔ یا پھر اپنی دانست میں اس جگہ کو ہی اپنے لیے نا مبارک سمجھا ہو گا۔ نادان کہیں کا!

چڑے کو نادان کہتے ہوئے مجھے اپنے بچوں کا خیال آیا۔ میں نے سب کو مخاطب کر کے تاکید کی "خبردار! آج سے ہمارے ہاں کوئی پتنگ نہ اڑے۔ ڈور کہیں سے بھی آئے فوراً ٹھکانے لگا دی جائے۔ یہ ڈور پرندوں کی سانسوں کی ڈور سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہوتی!!"

یہ سنتے ہی میری چھوٹی بیٹی نے پنجرے کا در کھول کر دونوں مصری چڑیوں کو آزاد کر دیا جو میری بیگم کل ہی مہنگے داموں خرید لائی تھیں۔ میں نے بیٹی کو غور سے دیکھا وہ کہنے لگی "بابا' ہم آیندہ پرندوں کو قید نہیں کریں گے تاکہ وہ انسانوں کو اپنا دوست ہی سمجھیں"۔

دِل نہیں مانتا

سلیم خاں گمی

اس روز [illegible] کے عرس کی مقامی چھٹی تھی۔ وقار نے فیصل سے کہا کہ میں مقبرہ جہانگیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ وقار چھوٹا تھا اور فیصل اس کا بڑا بھائی تھا۔ دونوں کی عمروں میں چھ سال کا فرق تھا۔ وقار 14 سال کا تھا اور درجہ نہم میں پڑھتا تھا۔ فیصل یونی ورسٹی کا طالب علم تھا اس نے اپنی کار لی وقار کو بٹھایا اور مقبرہ جہانگیر کی طرف چل پڑا۔ اسے ماڈل ٹاؤن سے شاہدرہ آنا تھا۔ وہ ماڈل ٹاؤن سے فیروز پور روڈ' چوبرجی' چوک یادگار' پرانا راوی پل اور ریلوے پھاٹک سے ہوتا ہوا مقبرہ جہانگیر پہنچا۔

وہ دونوں بھائی مقبرہ جہانگیر کے گیٹ پر اترے۔ فیصل نے کار پارک میں لگائی اور پھر وہ ٹکٹ لے کر مقبرہ کے اندر داخل ہو گئے۔ سہ پہر تک وہ مقبرہ جہانگیر کی روشوں پر گھومتے رہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ نور جہاں کے مقبرہ پر گئے اور کچھ دیر تک اس کے اردگرد پھیلے ہوئے باغیچوں میں ٹہلتے رہے۔ اب شام ہونے کو تھی۔ شاہدرہ موڑ کی طرف فرخ آباد میں کھجوروں کے اوپر دیکھتے ہی دیکھتے بادل چھا گئے اور ہوا کے کندھے پر سوار ہو کر شاہدرہ ٹاؤن کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ برسات کا موسم تو نہ تھا لیکن بارش چھم چھم ہونے لگی اور اندھیرا پھیل گیا۔ دونوں بھائی اپنی کار کی طرف بھاگے۔ فیصل آگے تھا اور وقار پیچھے۔ جب وہ کار کے قریب پہنچے تو فیصل نے دیکھا کہ دو نوجوان کار کے ساتھ کھڑے ہیں اور ایک نوجوان جھک کر کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ "کیا کر رہا ہے تو؟" فیصل نے کار کی طرف بھاگتے ہوئے غصے سے کہا۔ آواز سن کر ایک نوجوان نے پستول تان لیا اور دوسرا چپ چاپ کھڑا رہا۔ جو نوجوان جھک کر کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ فیصل نے جست لگا کر چاقو والے کو پکڑنا چاہا تو پستول والے نے فائر کیا جو وقار کو لگا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ فیصل مڑ کر وقار کی طرف بھاگا تو وہ تینوں وہاں سے بھاگ اٹھے اور درختوں میں سے ہو کر دیوار کی اوٹ میں چلے گئے۔

جب فیصل وقار کو لے کر ہسپتال پہنچا تو وہ اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ اس نے پہلے اپنے والد کو فون کیا پھر تھانے جا کر رپورٹ درج کروائی۔ سب انسپکٹر سعید خاں تفتیشی افسر مقرر ہوا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کا ایک ڈی ایس پی الٰہی بخش نگران مقرر ہوا۔

جب سعید خاں پہلی بار کیس پر بات کرنے کے لیے الٰہی بخش سے ملا تو اسے بتایا "گواہ صرف ایک ہے اور وہ ہے فیصل۔ اس نے جس آدمی پر فوٹو دیکھ کر قتل کا شبہ کیا ہے۔ مجھے یہ شبہ کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔ میرے خیال میں جس پر شبہ کیا گیا ہے وہ قاتل نہیں ہے"۔

"گواہی ٹھیک کیوں نہیں لگتی؟" الٰہی بخش نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"اس لیے کہ جب قتل ہوا شام ہونے والی تھی اس لیے اندھیرا ہو چلا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور دونوں بھائی بارش سے بچنے کے لیے مقبرہ سے بھاگتے ہوئے کار کی طرف آ رہے تھے اس لیے جلدی میں تھے۔ گولی فوراً چلی اور قاتل پارٹی فوراً ہی بھاگ اٹھی۔ ان حالات میں شناخت مشکوک ہو جاتی ہے"۔

"فیصل مشکوک طور پر کہتا ہے یا یقینی طور پر کہ نظاما قاتل ہے؟"

"وہ تو یقینی طور پر کہتا ہے کہ نظاما قاتل ہے۔ وہ اس قدر یقین سے نظامے کو قاتل بتاتا ہے کہ مجھے بھی شک ہونے لگا ہے کہ نظاما قاتل ہے"

"بے وقوف مت بنو۔ اچھا گواہ مل گیا ہے، خدا کا شکر ادا کرو اور اب گھر جاؤ۔ پچھلے دو دن سے تم آنکھ جھپکے بغیر اس تفتیش میں مصروف ہو"۔

مقتول کے بھائی فیصل نے انسپکٹر سعید کو بتایا تھا کہ قاتلوں میں سے ایک ملزم لمبا تڑنگا تھا۔ اس کے نین نقش تیکھے تھے۔ عمر 23 سال تھی۔ دوسرا درمیانے قد کاٹھ کا تھا اور موٹا تازہ تھا۔ اس کی عمر 20 سال ہو گی۔ تیسرا پانچ فٹ چھ انچ ہو گا عمر تقریباً 18 سال ہو گی۔ اس کے ہاتھ لمبے لمبے تھے اور ناک موٹی تھی۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا دوسرے کے ہاتھ میں چاقو اور تیسرا خالی ہاتھ تھا۔ جو ملزم کار کے ساتھ جھک کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور جس کے ہاتھ میں چاقو تھا وہ درمیانے قد کا تھا۔

انسپکٹر سعید سی آئی اسٹاف کے صدر دفتر جا کر دو دن تک ملزموں اور مجرموں کے سینکڑوں فوٹو دیکھتا رہا اور فیصل کو دکھاتا رہا۔ ان تصویروں میں نظامے کی تصویر نہ تھی۔ دو دن کے بعد جب انسپکٹر سعید ڈی ایس پی الٰہی بخش سے ملنے گیا تو ڈی ایس پی نے نظامے کو پکڑ کر ساتھ والے کمرے میں بٹھا رکھا تھا۔

"نظامے کو میں نے بلوا لیا ہے" الٰہی بخش نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر میں اور فیصل دو دن سی آئی ڈی اسٹاف کے دفتر میں جا کر فوٹو دیکھتے رہے ہمیں کوئی مشکوک فوٹو نہیں ملا" انسپکٹر سعید نے کہا۔

"جب مقتول کا بھائی کہتا ہے کہ گولی نظامے نے چلائی تھی تو آپ کیوں نہیں مانتے"

"قتل کا معاملہ ہے، اتنی جلدی یقین کیسے کر لوں" انسپکٹر سعید بولا

"اگر نظاما قاتل نہیں تو پھر کون قاتل ہے، بتاؤ؟"

"اس مرحلہ پر تو کچھ نہیں بتایا جا سکتا"۔

"تو پھر اسے لے جاؤ اور شرافت سے پوچھو کہ قتل کیوں کیا"۔

"ٹھیک ہے سر" اور انسپکٹر سعید خاں نظامے کو لے کر تھانے آ گیا اور اسے حوالات میں بند کر دیا۔ رات کو اسے اچھا کھانا دیا۔ دوبار چائے پلوائی۔ آدھی رات کو جب نیند نے اس پر حملہ کیا تو اسے سونے نہ دیا اور جگا کر اپنے کمرے میں لے آیا اور پوچھا۔ "فیصل نے تم کو پہچان لیا ہے نظامے! کہ تو قاتل ہے۔ تو کہتا ہے میں قاتل نہیں ہوں۔ اگر تو قاتل نہیں ہے تو پھر بتاؤ قاتل کون ہے؟"

"صاحب بہادر، میں قاتل نہیں ہوں لیکن مجھے واردات کا پتا ہے"۔

"اگر واردات کا پتا ہے تو پھر بتاؤ' دیر کاہے کی؟"

"گرفتاری سے پہلے میں بازار میں گھوم رہا تھا کہ مجھے جھیلا ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس سے قتل ہو گیا ہے۔ وہ اور اس کے دو ساتھی مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نورجہاں کی طرف گئے تھے۔ وہاں شام سے پہلے بارش ہو گئی۔ وہ کار کے ذریعے واپس آنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہاں کھڑی کسی کی کار کا دروازہ کھولنے لگے کہ کار کے اصل مالک آ گئے۔ وہ مجھے پکڑنا چاہتے تھے کہ میں نے گولی چلائی۔ چھوٹا کار مالک وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ہم دیوار کی اوٹ میں ہو گئے اور پھر بھاگ نکلے"۔

"جھیلا رہتا کہاں ہے؟" انسپکٹر سعید نے پوچھا

"لاہور میں بھاٹی گیٹ کے اندر" نظاما بولا۔

"کیا تو نے وہ جگہ دیکھی ہوئی ہے جہاں جھیلا رہتا ہے؟"

"ہاں وہ نالے کے پاس ایک مکان کی دوسری منزل میں رہتا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں"

دوسرے دن انسپکٹر سعید نے نظامے کو ساتھ لیا۔ ہتھ کڑی لے کر اس کا ایک سرا نظامے کی بائیں کلائی میں اور دوسرا سرا اپنی دائیں کلائی میں ڈالا' اس پر چادر ڈالی تاکہ ہتھکڑی چھپ جائے اور سارا دن چوک بھاٹی گیٹ سے بادشاہی مسجد تک سارا علاقہ چھان مارا مگر جھیلا نہ ملا۔ سٹی سینما کے پاس نظامے نے کچھ دور ایک شخص کو دیکھ کر کہا "شاید جھیلا ہے" چنانچہ وہ دونوں اس کے پیچھے بھاگے۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر بھاگا۔ دوپہر کے وقت یہ دوڑ بازار میں بیٹھے دوکان داروں نے حیرت اور دلچسپی سے دیکھی لیکن وہ شخص قابو نہ آیا۔ بلکہ پانی والے تالاب کے قریب ایک تنگ گلی میں گھس کر چھپ گیا۔ نالے کے قریب جھیلا جس مکان کی چھت پر دوسرے لوگوں کے ساتھ رہتا تھا وہ مکان اوپر نیچے بند تھا اور سب دروازوں کو تالے لگے ہوئے تھے۔

اسی روز آدھی رات کو انسپکٹر سعید نے پانچ ہتھیار بند جوان ساتھ لیے اور نظامے کے ساتھ اسی مکان پر چھاپا مارا۔ پانچ لڑکے قابو آئے لیکن ان میں جھیلا نہ تھا۔ ان سے چھریاں چاقو اور پستول برآمد ہوئے اور انسپکٹر سعید ان پانچوں کو پکڑ لایا اور بغیر لائسنس اسلحہ رکھنے کے جرم میں ان کو حوالات میں بند کر دیا۔ دوسرے دن فیصل کو بلوایا اور ملزموں کو دکھا کر پوچھا کہ اس کے تین ملزموں میں سے کوئی ان میں سے تو نہیں۔

فیصل پہلے نظامے کو پکڑوا چکا تھا اب اس نے اکری کی طرف اشارہ کیا کہ یہ بھی ان میں شامل تھا۔ چنانچہ اس کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ انسپکٹر سعید اسے اپنے کمرے میں لے گیا اور پوچھا "تجھے قتل کے الزام میں حراست میں لیا ہے۔ اس سلسلے میں جو کچھ جانتے ہو سچ سچ بتا دو"۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سچ سچ بتاؤں گا لیکن میرا نام کسی پر ظاہر نہ ہو۔ اگر ظاہر ہو گیا تو وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔ کیوں کہ جن کے متعلق میں بات کرنا چاہتا ہوں ان کا تعلق ایک جنونی گروہ سے ہے"۔

"میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ وعدہ کرتا ہوں" انسپکٹر سعید نے کہا۔

"جس روز وقار قتل ہوا اس روز میں نے رات اسی نالے والے مکان میں گزاری۔ میرے سامنے تین بندے وہاں سے گزرے۔ ایک کے پاس پستول تھا۔ ایک کے پاس چاقو تھا اور ایک خالی ہاتھ تھا۔ جھیلے کے پاس پستول تھا۔ ستار کے پاس چاقو اور چاند خالی ہاتھ تھا۔ قتل کے بعد وہ تینوں واپس آئے اور ان تینوں نے مجھے بتایا کہ ان سے قتل ہو گیا ہے"۔

"گویا جھیلا' ستار اور چاند قاتل ہیں" انسپکٹر سعید بولا۔

"جی مجھے پتا نہیں کہ اصل قاتل کون ہے۔ میں تو اس وقت جب قتل ہوا موجود نہیں تھا۔ مجھے تو ان تینوں نے جو بتایا میں نے آپ کو بتا دیا جی"۔

"فیصل کہتا ہے نظاما قاتل ہے"۔

"جی مجھے پتا نہیں۔ ممکن ہے ہو ممکن ہے نہ ہو"۔

"اب وہ کہتا ہے کہ اکری بھی قاتل ہے"۔

"اللہ جانتا ہے صاحب، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ زندگی موت کا سوال ہے"۔

"ایک تیسرا ملزم بھی ہے۔ وہ ہے چاند، نالے والے مکان سے اب جو لڑکے پکڑے ہیں ان میں چاند بھی ہے یا نہیں"۔

"نہیں ان میں چاند نہیں ہے"۔

"اس کا مطلب ہوا اسے تلاش کرنا ہو گا"۔

انسپکٹر سعید نے اکری کو بھی باقاعدہ گرفتار کر لیا کیوں کہ فیصل نے ایک بار پھر یقین کے ساتھ کہا تھا کہ وہ بھی میرے بھائی کے قتل کی واردات میں شامل ہے۔

ایک ہفتے کے بعد انسپکٹر سعید ڈی ایس پی ہیڈ کوارٹر الٰہی بخش سے پھر ملا اور اس سے وقار کے قتل کی تفتیش پر گفتگو کی۔ الٰہی بخش نے کہا سعید خاں! آپ نے بہت محنت کی ہے۔ آپ نے وقار کے کیس پر دن رات ایک کر دیا ہے۔ نظاما اور اکری قاتل ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ کہو"۔

"صاحب دل نہیں مانتا" انسپکٹر سعید نے کہا۔

"کیا کہا۔ دل نہیں مانتا؟" الٰہی بخش حیران ہو کر بولا۔

"جی صاحب، دل نہیں مانتا۔ دل کہتا ہے فیصل کا خیال غلط ہے"۔

"موقع کا چشم دید گواہ صرف ایک ہے اور وہ ہے مقتول کا بھائی فیصل۔ ہم اس کی گواہی پر انحصار نہیں کریں گے تو اور گواہ کہاں سے لائیں گے"۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر! لیکن میرا دل کہتا ہے ابھی اور محنت کرو"۔

"کون روکتا ہے آپ کو؟ اور محنت کرو۔ چاند کا بھی پتا کرو۔ وہ قاتلوں کی تکون کا تیسرا زاویہ ہے"۔

انسپکٹر سعید اٹھ کر چلا آیا۔ وہ اگر چاہتا تو چاند کو لاپتا قرار دے کر نظاما اور اکری کے خلاف چالان عدالت کو بھیج دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ وہ سچائی کی تلاش میں تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ نظاما اور اکری ملزم نہیں ہیں۔ ملزم اور ہیں۔ فیصل کی شناخت درست نہیں۔ بارش اور اندھیرے کی وجہ سے اسے غلطی لگ گئی ہے۔ نظاما اور اکری تو جیل

بھجوا دیئے گئے لیکن چاند کا کوئی پتا نہ چل رہا تھا۔ اکری کے ایک دوست نے کہا تھا کہ وہ چاند کو جانتا ہے اس لیے اسے تلاش کرنے میں مدد دے گا۔ اس دوست کا نام بھاگو تھا۔

انسپکٹر سعید چاند کی تلاش اپنی روزمرہ ڈیوٹی کے بعد کیا کرتا اور عموماً سفید لباس میں ہوتا یعنی وردی کے بغیر۔ وہ شلوار قمیص اور ٹوپی پہن کر گلیوں بازاروں میں نکل جاتا اور لوگوں سے پوچھتا۔ چاند جس تنگ گلی میں رہتا تھا وہاں اسے کوئی نہ جانتا تھا اور اگر کوئی جانتا تھا تو ڈر اور خوف کے مارے اس کا نام لینے سے کتراتا تھا۔ اسی طرح دو مہینے گزر گئے انسپکٹر سعید نے چاند کی گلی کے دس چکر لگائے لیکن بے فائدہ۔

ایک دن انسپکٹر سعید بھاگو کو لے کر کرائم برانچ کے صدر دفتر گیا اور وہاں وہ دونوں سارا دن بیٹھے مجرموں کے فوٹو دیکھتے رہے اور چائے پیتے رہے۔ آخر ایک فوٹو ایسا ملا جو چاند کا تھا۔ صدر دفتر نے بتایا کہ یہ لڑکا چاند ہے' راوی روڈ پر ٹرکوں اور بسوں سے سامان چوری کرنے والے ایک گروہ کا رکن ہے اور اس کے خلاف ایک کیس تھانہ راوی روڈ میں درج ہوا تھا لیکن اس کا اصل نام چاند نہیں بلکہ شفیق ہے۔ جب انسپکٹر سعید اور بھاگو تھانہ راوی روڈ پہنچے اور کاغذات کی پڑتال کی تو یہ بات سچ ثابت ہوئی۔ چاند کا اصل نام شفیق ہے۔ اس کی عمر 18 سال تھی۔ قد درمیانہ تھا۔ چہرے کا رنگ سانولا تھا۔ پولیس نے اسے اشتہاری قرار دیا تھا۔

اب جب ڈی ایس پی الٰہی بخش سے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ملاقات ہوئی تو وہ جھنجلا کر بولا "سعید خاں' دیر کر رہے ہو۔ نظاما اور اکری جیل میں ہیں۔ چاند لاپتا ہے۔ اسے لاپتا قرار دو۔ فیصل کی گواہی کافی ہے' اگر ناکافی ہے تو اسے کہو ایک دو گواہ اور دے۔ چالان عدالت میں پیش کرو اور کام ختم کر کے آرام کا سانس لو"۔

"ایسا ہو سکتا ہے اور کیا جا سکتا ہے" انسپکٹر سعید نے کہا۔

"تو پھر کرتے کیوں نہیں؟"

"سوچ رہا ہوں لیکن دل نہیں مانتا"۔

"لمبے چکر میں نہ پڑو۔ مرنے والا بچہ یعنی وقار جس باپ کا بیٹا تھا میں اسے جانتا ہوں۔ وہ دیانت دار اور شریف آدمی ہے۔ لیکن دو ملزموں کی سزا کے بعد اس کا دکھ ضرور کچھ کم ہو گا"۔

"میں دکھ درد کے چکر میں نہیں ہوں۔ میں تو قانون اور انصاف کے چکر میں ہوں۔ میں قانون اوز اپنے ضمیر کے مطابق انصاف کی تلاش میں ہوں صاحب"۔

"اگر تو اسی چکر میں رہا تو بہت دیر ہو جائے گی۔ مجھے مجبوراً تفتیش تبدیل کرنا ہو گی"۔

"ضرور کر دیں۔ آپ کر سکتے ہیں لیکن میں کسی بے گناہ کو سولی پر کیسے لٹکا دوں۔ انصاف میرا مشن ہے"۔

"میں آپ کو چالان تیار کر کے عدالت میں بھیجنے کے لیے پندرہ دن دیتا ہوں۔ اب تم جا سکتے ہو۔ پندرہ دنوں کے بعد ایک دن بھی نہیں ملے گا"۔

ایک دوپہر انسپکٹر سعید اور بھاگو سفید کپڑوں میں ملبوس لاہور کے کوچہ چابک سواراں میں جا رہے تھے کہ بھاگو نے زور سے کہا "نظاما جا رہا ہے"۔ یہ فقرہ نظامے نے بھی سن لیا تھا۔ لیکن انسپکٹر سعید بولا "وہ تو جیل میں ہے"۔

پہلے بھاگو اس کے پیچھے بھاگا اور پھر انسپکٹر سعید۔ نظاما بھی بھاگ اٹھا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے بھاگے۔ چھوٹی اور تنگ گلیوں میں وہ تینوں بھاگتے رہے۔ نظاما ان گلیوں کو خوب جانتا تھا۔ بھاگو اس سے کم نہ تھا۔ انسپکٹر سعید بھی کئی سال ان گلیوں میں گھومنے پھرنے کے بعد ماہر ہو گیا تھا۔ ایک تنگ گلی میں بھاگتے ہوئے نظامے نے مڑ کر فائیر کیا جس نے بھاگو کے بائیں کندھے کو بری طرح زخمی کیا اور وہ گھبرا کر گر پڑا۔ انسپکٹر سعید نے نظامے پر الٹا فائر کیا۔ گولی اسے چیرتی ہوئی پھیپھڑے میں ٹھہر گئی اور وہ ہسپتال جا کر دم توڑ گیا۔ معلوم ہوا وہ نظاما نہیں ستارا تھا۔ البتہ اس نے مرنے سے پہلے اقرار کر لیا کہ وقار کو قتل کرنے والوں میں شامل

تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ باقی دو شخص جھیلا اور چاند ہیں۔

بھاگو کا کندھا چھ سات دنوں میں قدرے ٹھیک ہو گیا۔ وہ دونوں اس دن ہسپتال سے ڈاکٹر کو مل کر پیدل آرہے تھے کہ سامنے سے ایک نوجوان آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ اس کا چہرہ ان لمبے لمبے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ بھاگو نے اسے دیکھ کر کہا "دیکھو! چاند آرہا ہے"

"کہاں؟"

"سامنے، لمبے بالوں والا"۔

انسپکٹر سعید نے چیتے کی طرح جست بھری اور اسے پکڑ لیا۔ رکشے والے کو ٹھہرایا اور چاند کو اس میں زبردستی ڈال کر تھانے لے گیا۔ اسے اپنے کمرے میں بٹھایا اور نہایت سکون سے پوچھا۔

"تو قاتل ہے۔ تو نے جھیلے اور ستارے کے ساتھ مل کر کار چوری کرتے ہوئے ایک شام فیصل کو قتل کیا تھا"۔

"نہیں میں قاتل نہیں ہوں"۔

"تو جھیلے اور ستارے کے ساتھ تھا یا نہیں؟"

"میں ساتھ تھا لیکن میں نے کار کی چوری اور قتل میں حصہ نہیں لیا"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میرے پاس نہ پستول تھا، نہ چاقو، نہ چھری، نہ میں نے کہا کار چوری کرو، نہ میں نے کہا کسی کو گولی مارو"۔

"اس کا مطلب ہے کہ تو اپنے آپ کو قاتل تصور نہیں کرتا"۔

"نہیں، قاتل جھیلا اور ستارا ہے۔ ان کے پاس ہتھیار تھے"۔

"وہ دونوں کہاں ہیں؟"

ستارا تو آپ جناب کی گولی سے مارا گیا اور جھیلا ایک مہینا پہلے فرخ آباد میں کباڑیوں سے چوری کے مال پر جھگڑ پڑا اور مارا گیا"۔

انسپکٹر سعید نے تفتیش بند کی۔ چاند کو ہتھکڑی لگا کر اپنی میز کے ساتھ باندھا اور خود شاہدرہ تھانے روانہ ہوا۔ وہاں جا کر پتا کیا تو معلوم ہوا چاند سچ کہتا ہے۔ انسپکٹر سعید نے اس کی تصویر دیکھی جو کسی قدر اکری سے ملتی تھی۔ ستارے کی تصویر بھی اس کے پاس تھی جو نظامے کی شکل سے مشابہت رکھتی تھی۔ سرسری طور پر دیکھنے سے ستارا اور نظاما جڑواں بھائی دکھائی دیتے تھے لیکن تفتیشی افسر تو سرسری باتوں پر نہیں جاتے۔ وہ گہرا سوچتے ہیں۔ گواہ دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ وہ دھوکہ بھی دیتے ہیں۔ اسی لیے انسپکٹر سعید ایک اچھے تفتیشی افسر کی طرح اصل ملزموں اور گواہوں کی تلاش میں تھا۔

تھانے پہنچ کر انسپکٹر سعید نے چاند سے کہا "تو نے سچ کہا تھا۔ جھیلا اور ستارا قاتل ہیں۔ نظاما اور اکری قاتل نہیں ہیں ان کی تو محض شکلیں ان سے ملتی تھیں یعنی وہ ایک دوسرے کے ہم شکل تھے"۔

"جی جناب، قاتل نہ نظاما نہ اکری، قاتل جھیلا اور

ستارا اور وہ دونوں مر چکے ہیں" چاند بولا۔

"وقار کا اب ایک قاتل ہے اور وہ تو ہے۔ تیسرا قاتل چاند" سعید نے کہا۔

"قاتل دو تھے جو مارے گئے اور وہ تھے جھیلا اور ستارا۔ میں قاتل نہیں ہوں۔ نہ میں نے کہا کار چوری کرو نہ میں نے کہا گولی چلاؤ۔ میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہ تھا" چاند نے دلیل پیش کی۔

"نظاما اور اکری جیل میں ہیں۔ اگر میں دل کی بات نہ مانتا تو وہ یا پھانسی چڑھ جاتے یا ساری عمر جیل میں سڑتے"۔

"اب ان کا کیا بنے گا؟" چاند نے پوچھا۔

"اب ان کو رہائی دلائیں گے۔ تو ان کو ملنا چاہتا ہے تو بتا" انسپکٹر سعید نے پوچھا۔

"ہاں میں ان کو تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ میں ملنا چاہوں گا ان کو لیکن ہتھکڑی کے ساتھ نہیں"۔

"ہتھکڑی کے بغیر بھاگ جائے گا تو" انسپکٹر سعید بولا۔

"اگر میں ایسا کروں تو مجھے گولی مار دینا" چاند نے کہا۔

"اب تو قاتل ہے پھر میں بن جاؤں گا"۔

"میں قاتل نہیں ہوں۔ مجھ پر شبہ کیا جا رہا ہے"۔

اگلے دن وہ دونوں کیمپ جیل گئے اور اکری سے ملے۔ وہ چاند کو جانتا تھا اور چاند اس کا واقف تھا۔ اس نے چاند کے سامنے ہاتھ باندھے کہ اس کو سولی کے تختے سے بچایا جائے۔ شام کو وہ تھانے واپس آگئے۔

اب انسپکٹر سعید کے سامنے مسئلہ قاتلوں کی گرفتاری کا نہ تھا۔ دو قاتل مارے جا چکے تھے۔ ایک قاتل حوالات میں تھا۔ اب مسئلہ تو اکری کا تھا جو بے گناہ تھا اور اصل قاتل کا ہم شکل تھا۔ مقتول کا بھائی، فیصل تو گواہی دے چکا تھا کہ یہی دو قاتل ہیں۔ وہ بھی سچا تھا کیوں کہ اکری کی صورت جھیلے سے ملتی تھی اور چاند کو اس نے پہچانا ہی نہ تھا۔ دو بے گناہ اور معصوم آدمیوں کی زندگی بچانا بہت ضروری تھا۔ یہ اس وقت نہ ہو سکتا تھا جب تک چاند گواہی نہ دے۔ اور چاند کی گواہی تب موثر ہو سکتی تھی جب وہ یہ کہے کہ تیسرا آدمی وہ خود ہے اور جب وقار پر گولی چلی وہ وہاں موجود تھا۔

انسپکٹر سعید نے سارا مسئلہ ڈی ایس پی الٰہی بخش کے سامنے رکھا تو وہ بولا "چاند پر تیسرا طریقہ آزماؤ"۔

یعنی یہ کہ اسے مار پیٹ کر منوا لو کہ وہ موقع واردات پر موجود تھا۔ انسپکٹر سعید نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔

اگلے دن چاند کو ملنے کے لیے ایک بڑھیا تھانے آئی۔ چاند یتیم تھا یعنی بچپن میں ہی اس کی ماں فوت ہو چکی تھی۔ باپ پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ یہ اس کی خالہ تھی جس نے حج کیا ہوا تھا۔ وہ ساری دوپہر اس کے پاس رہی اور اس سے باتیں کرتی رہی۔ جب وہ شام کو واپس اپنے گھر جانے لگی تو اس نے چاند سے کہا نماز پڑھا کرو اور اللہ کو یاد کیا کرو اور گواہی کو کبھی نہ چھپاؤ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ وہ دوسرے دن پھر آئی اور اس کے لیے کھانا لائی۔ شام کو واپس چلی گئی۔ اس رات چاند نے انسپکٹر سعید سے کہا "آپ جس تیسرے قاتل کی بات کرتے ہیں وہ میں ہوں۔ میں عدالت میں گواہی دوں گا کہ قاتلوں میں بھی شامل تھا اور نظاما اور اکری قاتل نہیں ہیں۔ اصل قاتل جھیلا اور ستارا ہیں"۔

سعید خاں اچھل پڑا۔ دوسرے دن اس نے کیس تیار کیا۔ الٰہی بخش کو دکھایا اور عدالت کو بھجوا دیا۔

عدالت نے نظامے اکری اور چاند کو چھوڑ دیا۔ عدالت نے فیصلے میں لکھا کہ چاند کو اس لیے چھوڑا ہے کہ اس نے جرات سے سچ بولا ہے اور انصاف کے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کی نیز مقتول کے ورثا نے بھی عدالت کو لکھ کر دیا ہے کہ وہ چاند کو معاف کرتے ہیں۔

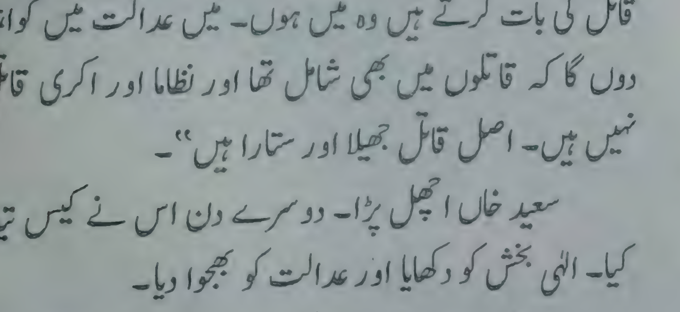

ستمبر کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں چار شہزادے، دو کلو چینی، سرخ گلاب اور خزانہ مل گیا بہت اچھی تھیں (ہما صابر ہری پور)

ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی خاص طور پر دو کلو چینی، سرخ گلاب اور زندہ و پائندہ چونڈہ بہت اچھی تھیں۔ (نظیفہ رشید اوکاڑہ)

ستمبر کا سرورق کچھ خاص نہیں تھا مگر باقی رسالہ بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں زندہ و پائندہ چونڈہ، چار شہزادے، سرخ گلاب اور یادگار لمحے بہت پسند آئیں۔ انکل! مجرم کون کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں اور کھیلوں کی دنیا میں تمام پاکستانی کرکٹرز کا باری باری انٹرویو دیں (ہما اقبال جہلم)

میں تعلیم و تربیت کو اپنے بچپن سے پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ اس کی تحریریں اتنی مزے دار ہوتی ہیں کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ ہر تحریر اپنی جدا شناخت رکھتی ہے۔ طنز و مزاح ہو، جاسوسی ہو یا سائنس ہر کہانی اپنی مثال آپ ہے (نبیل دہلوی کراچی)

چار شہزادے، دو کلو چینی، دھوپ چھاؤں اور زندہ و پائندہ چونڈہ بہترین تھیں۔ کرکٹ کے عالمی ریکارڈ بہت دلچسپ و عجیب تھے۔ مجرم کون، باتیں بڑوں کی اور چٹ پٹے مسالے دار جلد شروع کریں (محمد سلیم اعوان پوٹہ)

کہانیوں میں چار شہزادے کا دوسرا حصہ، دو کلو چینی اور خزانہ مل گیا اور زندہ و پائندہ چونڈہ اچھی تھیں (فضل محمود آفریدی کھوڑ)

تمام کہانیاں اچھی تھیں خاص طور پر چار شہزادے کا دوسرا حصہ بہت پسند آیا۔ دو کلو چینی، اور خزانہ مل گیا اور سرخ گلاب بھی اچھی تھیں۔ نظموں میں اسکول کھل گئے بہت اچھی تھی (عامر احمد میانوالی)

اس مہینے کہانیوں میں چار شہزادے، دو کلو چینی، امن کا تحفہ، اور زندہ و پائندہ چونڈہ اچھی تھیں۔ اس کے علاوہ دل چسپ اور ناقابل یقین، ہونہار مصور اور کھیلوں کی دنیا بہترین سلسلے تھے (عمر جاوید نوشہرہ چھاؤنی)

ستمبر کا چمکتا دمکتا شمارہ ملا۔ امن کا تحفہ، اور خزانہ مل گیا اور سرخ گلاب کہانیاں بہت ہی پسند آئیں (عبدالماجد آزاد بلوچ)

اگست کے شمارے کا سرورق لاجواب تھا۔ نیاز علی بھٹی کی کہانی چار شہزادے بہت اچھی تھی۔ ڈاکٹر رضوان ثاقب کی کہانی اور خزانہ مل گیا بھی دلچسپ تھی (فاخرہ رشید راول پنڈی)

اس ماہ کا تعلیم و تربیت بہت اچھا رہا۔ کہانیوں میں چار شہزادے اور ربو رانی کی آپ بیتی بہت مزے دار تھیں! آپ سے گزارش ہے کہ کھیلوں کی دنیا میں عامر سہیل اور آفریدی کا انٹرویو شائع کریں! (ریما طارق سیال کوٹ)

دل چسپ اور ناقابل یقین خاص طور پر بہت پسند آئے۔ ملا جی سے ملاقات بھی بڑی دل چسپ رہی (محمد نبیل کوکب پشاور)

سب کہانیاں اچھی تھیں خصوصاً چار شہزادے، دھوپ چھاؤں اور زندہ و پائندہ چونڈہ زبردست تھیں۔ اس کے علاوہ کرکٹ کے عالمی ریکارڈ پڑھ کے بھی مزا آیا (چودھری محمد امتنان حیدر فیصل آباد)

سارا شمارہ بہت زبردست تھا۔ لطائف اور ملا نصرالدین بہت پسند آئے (سمیعہ حسن لاہور)

ٹائٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سب سے پہلے کھیلوں کی خبریں پڑھیں اور اس میں ٹسٹ کرکٹ کی پوری تاریخ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اب آپ ہمیں ون کرکٹ کے ریکارڈز اور فرسٹ کلاس کرکٹ کی تاریخ اور اس کے ریکارڈز بھی بتائیں (وقاص حیدر رنگیاں)

کہانیوں میں ڈاکٹر رضوان ثاقب کی اور خزانہ مل گیا۔ اور سلیم خان گمی کی زندہ و پائندہ چونڈہ اول نمبر پر رہیں۔ آئیے مسکرائیں میں بہت دل چسپ لطیفے تھے (ہابیل مسعود خان پپلاں)

میری تجویز ہے کہ ملا کی کہانی میں صرف مکالمے ہی دیئے جائیں یعنی کہانی اپنی زبانی نہ پیش کی جائے۔ اس سے کہانی کا مزہ پھیکا ہو جاتا ہے (رابعہ افتخار لاہور)

تعلیم و تربیت کا معیار روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اس ماہ تمام کہانیاں اچھی تھیں لیکن دو کلو چینی، چار شہزادے کا دوسرا حصہ، دھوپ چھاؤں کی چوتھی قسط اور سرخ گلاب تو لاجواب تھیں (شہزاد اسفندیار گجرات)

کہانیاں سب اچھی تھیں۔ ملا نصرالدین نے تو کمال ہی کر دیا۔ لڑکیوں کے لیے بھی کوئی سلسلہ شروع کریں (فریحہ گوہر فیصل آباد)

ستمبر کا شمارہ بہت ہی پسند آیا۔ آپ سے ایک درخواست ہے کہ مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں (محمد ضمیر اعظم کاہلوں ڈھاب والا)

اس بار سرورق بہت خوب تھا۔ چار شہزادے کا دوسرا حصہ بھی پسند آیا۔ کہانیوں میں دو کلو چینی، اور خزانہ مل گیا اچھی لگیں۔ لڑکیوں کے لیے

بھی کوئی سلسلہ شروع کریں (عائشہ افتخار لاہور)

تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ سرورق بہت خوب صورت تھا (محمد طارق ڈیرہ اسماعیل خان)

کل پہلی دفعہ تعلیم و تربیت پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سارا رسالہ ہی تعریف کے لائق ہے۔ یقیناً آپ نے اس دور میں اس جیسا معیاری رسالہ نکال کر تعمیر ملت کا فریضہ انجام دیا ہے اور ہماری یہی دعا ہے کہ آپ اسی طرح یہ فریضہ انجام دیتے رہیں (سمیرا اعوان گجرات)

اس دفعہ سارا رسالہ شان دار تھا۔ خاص طور پر چار شہزادے، سرخ گلاب، دو کلو چینی اور زندہ و پائندہ چونڈہ بہت پسند آئیں۔ لطیفے اس دفعہ پھر نمبر لے گئے۔ شعر و شاعری کا سلسلہ شروع کریں (خواجہ محمد عامر ساہی وال)

ہم لوگ تعلیم و تربیت غالباً پچھلے دو سال سے پڑھ رہے ہیں۔ ہمارے گھر میں سبھی اس کے دیوانے ہیں کیا بڑے، کیا چھوٹے سبھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس کی کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں۔ اس کے تمام سلسلے ہمیں بہت پسند ہیں "مجاہدین آزادی" اور "نام ور لوگ" دوبارہ شروع کیے جائیں (ثاقب خالد نعمان اشرف سیال کوٹ)

کرکٹ کے عالمی ریکارڈ پڑھ کر بہت معلومات حاصل ہوئیں۔ آپ سعید انور کا انٹرویو بھی شائع کریں اور کھیلوں کی دنیا میں اس ہر ماہ ہونے والے سب کھیلوں کے بارے میں بتایا کریں اور ہاں اس ماہ "صحارا کپ" بھی ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ پاکستانی ٹیم فتح یاب ہو کر وطن واپس لوٹے۔ پاکستان اس سال یعنی 1998ء میں کرکٹ کے ٹورنامنٹ جہاں کھیلے گا اور جس تاریخ کو کھیلے گا اس کے بارے میں آپ کھیلوں کی دنیا میں پہلے سے بتا دیں (ملک اشتیاق محمود اعوان رکھی)

خداوند کریم آپ کو ملک و قوم کی امانت یعنی بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے سدا زندہ رکھیں۔ میں نے ابھی ابھی تعلیم و تربیت مکمل کیا ہے۔ میں عرصہ دو سال سے اس کا قاری ہوں۔ اس دفعہ کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے (حافظ اظہر فاروق مقام نہیں لکھا)

اس ماہ کا شمارہ بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ سرورق بہت اچھا تھا۔ نظمیں اچھی تھیں۔ کہانیوں میں سے چار شہزادے، اور خزانہ مل گیا، دو کلو چینی، سرخ گلاب اور دھوپ چھاؤں کی چوتھی قسط بہت اچھی لگیں۔ انکل، اب مجرم کون کا سلسلہ بھی شروع کر دیں (کالا گوجراں)

چار شہزادوں نے تو رسالے کو چار چاند لگا دیئے۔ اس کے علاوہ دو کلو چینی اور زندہ و پائندہ چونڈا، سچائی کی منہ بولتی تصویریں تھیں (نعیم جاوید صدیقی کالیکی منڈی)

شرارتی لکیریں اور کارٹون کہانی پڑھ کر بہت مزا آیا۔ پلیز، ہونہار فوٹو گرافر کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیں (مدیحہ اور عینی لاہور)

انکل، چٹ پٹے مسالے دار اور بلاعنوان کی جگہ مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں (نسیم شاہ گجرات)

مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں وہ میرا پسندیدہ سلسلہ تھا اور کھیلوں کی دنیا میں صرف کرکٹ کی باتیں ہی ہونی چاہیں (شمیم بشیر، طاہرہ بشیر، شیبا شہزاد)

ستمبر کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ مگر زندہ و پائندہ چونڈہ سب سے سبقت لے گئی۔ سلسلے وار ناول دھوپ چھاؤں کا تو جواب نہیں۔ درس قرآن کا سلسلہ بہت مفید ہے لیکن مختصر ہے اسے دو صفحوں پر ہونا چاہیے۔ مجرم کون شروع کریں (حافظ معظم معین لاہور)

مجھے یہ رسالہ پڑھتے ہوئے دس سال سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں لیکن میرا اس سے دل نہیں اکتایا، رسالہ ہی ایسا ہے۔ ہر دفعہ کی طرح تمام کہانیاں بہت اچھی لگیں ٹائٹل بھی اچھا لگا (فاطمہ گل لاہور)

ٹائٹل اچھا تھا۔ مگر ستمبر کے حوالے سے ہوتا تو بہت ہی اچھا لگتا۔ کہانیاں بہت ہی اچھی تھیں مگر چار شہزادے، سرخ گلاب، زندہ و پائندہ چونڈہ، اور خزانہ مل گیا بہت پسند آئیں اور سائنس فکشن بہت ہی زبردست رہا (نایاب کنول راول پنڈی)

ٹائٹل اچھا لگا۔ کہانیوں میں خزانہ مل گیا۔ سرخ گلاب، دو کلو چینی اور دھوپ چھاؤں اچھی لگیں (تحریم جاوید لاہور)

اس دفعہ آپ بھی لکھیے میں افقا ارشد کی کہانی نیکی کام آگئی نقل شدہ ہے یہ اس سے پہلے اکتوبر 1996ء کے تعلیم و تربیت میں "کوئی نیکی کام آئی" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ ثبوت کے لیے تراشہ بھیج رہے ہیں (سید ذیشان حیدر عباس نقوی رحمت آباد، بشرا ناز گوجر خان۔ صائمہ علیم لاہور، ذیشان احمد خان ہری پور، محمد ساجد انصاری ڈنگہ، محمد عمار اکرم فیصل آباد۔ محمد عرفان آفریدی کوہاٹ، وقار عباس سرگودھا، نعیم الرحمان سیال کوٹ، عظمیٰ سجاد لاہور۔ سائرہ رؤف لاہور۔ محمد نوید یاسین احمد پور شرقیہ، عائشہ رحمان سرائے عالم گیر۔ راشد حسن فیصل آباد۔ فواد چشتی احمد پور شرقیہ)

☆ افقا ارشد کو بلیک لسٹ کر دیا گیا ہے۔ اب ان کی کوئی تحریر تعلیم و تربیت میں شائع نہیں ہوگی۔ اڈیٹر

کہانیاں ہر مہینے ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہیں۔ اس دفعہ چار شہزادے کا دوسرا حصہ پسند آیا۔ اس کے علاوہ دو کلو چینی، اور خزانہ مل گیا اور زندہ و پائندہ چونڈہ اچھی لگیں۔ اس دفعہ آپ نے سچی کہانی نہیں دی۔ انکل اتنے بچے "مجرم کون" کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنا کا کہہ رہے ہیں تو آپ یہ سلسلہ شروع کر دیں (محمد اطہر زبیری، جب چکی)

ستمبر کا تعلیم و تربیت بہترین تھا۔ کہانیوں میں "زندہ و پائندہ.... چونڈہ"

نمبر1 رہی۔ باقی کہانیاں جن میں چار شہزادے، دو کلو چینی اور دھوپ چھاؤں شامل ہیں اچھی تھیں۔ کھیلوں کی دنیا میں ٹسٹ کرکٹ کے ریکارڈ بہت اچھے تھے۔ آپ اگلی دفعہ ون ڈے کرکٹ کے ریکارڈ شامل کریں اور بلاعنوان کہانی بھی شروع کریں (تنویر احمد راول پنڈی)

ستمبر کا سرورق بہت زبردست تھا۔ کہانیوں میں چار شہزادے، دو کلو چینی، سرخ گلاب، دھوپ چھاؤں اور..... اور خزانہ مل گیا بہت اچھی تھیں۔ آپ مجرم کون؟ کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیں (انعم انجم لاہور)

مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ یہ پاکستان کا نمبرون رسالہ ہے۔ پہلے میں اسے اپنی دوست سے لے کر پڑھتی تھی لیکن اب میں خود خریدتی ہوں اور خوب مزے کے ساتھ پڑھتی ہوں (سعدیہ حنا شاہدرہ ٹاؤن)

سرورق نہایت عمدہ تھا۔ کہانیوں کا بھی جواب نہیں تھا۔ خاص طور پر دو کلو چینی اور سرخ گلاب تو بہت ہی اچھی تھیں (مدیحہ خورشید اسلام آباد)

تعلیم و تربیت کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ ستمبر کا شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ تمام کہانیاں نمبرون تھیں۔ خاص طور پر دو کلو چینی اور خزانہ مل گیا بے حد پسند آئیں۔ اقوال زریں اور چٹ پٹے مسالے دار کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے (ذیشان کوثر صدیقی)

ستمبر کا رسالہ ماشاءاللہ بہت اچھا تھا اور انشاءاللہ اچھا رہے گا۔ سرورق تو بہت ہی اچھا تھا۔ اب آپ مجرم کون کا سلسلہ شروع کریں (محمد سیف اللہ، نصر اللہ، عبدالروف، اسداللہ رحیم یار خان)

ٹائٹل بہت پسند آیا۔ خاص طور پر چار شہزادے کا دوسرا حصہ بہت اچھا تھا۔ ہونہار کا سلسلہ بھی بہت اچھا ہے بلاعنوان جیسے اور سلسلے بھی شروع کیے جائیں (رانا غلام مصطفیٰ تاندلیانوالہ)

ستمبر کا شمارہ شاندار ثابت ہوا۔ سب سے بہترین کہانی چار شہزادے تھی۔ اس کہانی کو پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ باقی کہانیوں میں سرخ گلاب، اور خزانہ مل گیا اور زندہ و پائندہ چونڈہ زبردست تھیں (ناجیہ علیزئی حضرو)

چار شہزادے اور دو کلو چینی پسند آئیں۔ اس کے علاوہ ہونہار مصور اور شرارتی لکیریں سلسلے بہت اچھے لگے (حنا ممتاز سانگلہ ہل)

تعلیم و تربیت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ بلاشبہ یہ ایک تعلیمی، تفریحی اور معلوماتی رسالہ ہے۔ اس کی ہر کہانی میں ایک سبق ہوتا ہے۔ آپ اسلاف کے کارنامے شائع کرکے وہ بھی عام فہم انداز میں بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کر رہے ہیں۔ کہانیوں میں امن کا تحفہ، سرخ گلاب اور دو کلو چینی پسند آئیں۔ نظم اسکول کھل گئے بہترین تھی (آسیہ تبسم بہاول پور)

ستمبر کا رسالہ بہت اچھا لگا۔ سرورق دیکھ کر دل گارڈن گارڈن ہوگیا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں خاص کر چار شہزادے، اور خزانہ مل گیا، امن کا تحفہ بہت پسند آئیں (لبنیٰ اسلم بہاول پور)

ستمبر کا تعلیم و تربیت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موصول ہوا۔ کلر فل سرورق ٹھیک ٹھاک پسند آیا۔ چار شہزادے نہایت اچھی لگی (عدنان حسن عابدی کراچی)

ستمبر کے تعلیم و تربیت کی سب کہانیاں اچھی تھیں۔ خاص طور پر چار شہزادے، دو کلو چینی، اور خزانہ مل گیا زبردست تھیں۔ اب مجرم کون کا سلسلہ بھی شروع کردیں (عمیرا اعجاز بٹ سیال کوٹ)

چار شہزادے، دو کلو چینی، سرخ گلاب، اور خزانہ مل گیا پسند آئیں۔ "مجرم کون" کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں (سدرہ جمال فیصل آباد)

ستمبر کا شمارہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں چار شہزادے کا دوسرا حصہ، امن کا تحفہ، اور خزانہ مل گیا بہت اچھی تھیں۔ نظموں میں اسکول کھل گئے اچھی لگی۔ سرورق بھی بہت پسند آیا۔ اتنے زیادہ ساتھیوں نے رائے بھیجی ہے کہ آپ مجرم کون کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں لیکن ابھی تک آپ نے ہماری بات نہیں مانی۔ آخر کیوں؟ (مائرہ جاوید احمد پور شرقیہ)

سرورق موقع سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ کہانیوں میں زندہ و پائندہ.....چونڈہ اور دو کلو چینی بہترین تھیں۔ (محمد سلمان بن منور لاہور)

اس دفعہ کا تعلیم و تربیت بہت اچھا لگا۔ اس میں چار شہزادے، سرخ گلاب اور سائنس فکشن بہت اچھی تھیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اقوال زریں بھی شائع کیا کریں (زوبیہ ممتاز سانگلہ ہل)

سرورق اچھا تھا۔ کہانیاں جو نمبر لے گئیں، ان میں سرخ گلاب، اور خزانہ مل گیا، زندہ و پائندہ چونڈہ تھیں۔ نظموں میں اسکول کھل گئے اور 6 ستمبر اچھی لگیں۔ کھیلوں کی دنیا میں اگلے ماہ شاہد آفریدی کا پورا ریکارڈ شائع کریں (محمد طاہر عمران ڈیرہ اسماعیل خان)

کہانیاں تمام شان دار تھیں۔ خاص طور پر سلسلہ وار ناول دھوپ چھاؤں تو بہت ہی مزے دار تھا۔ سپورٹس کے صفحہ پر سعید انور یا شاہد آفریدی کا انٹرویو شائع کریں (شیخ عثمان احمد خانیوال)

سرورق شاندار تھا۔ چار شہزادے کا دوسرا حصہ بہت اچھا رہا۔ دو کلو چینی سرخ گلاب اور..... اور خزانہ مل گیا پسند آئیں۔ زندہ و پائندہ چونڈہ نے تو کمال کردیا۔ کھیلوں کے عالمی ریکارڈ بہت اچھے تھے (امجد اسلام امجد اوکاڑہ)

اس دفعہ کہانیوں میں چار شہزادے، دو کلو چینی اور خزانہ مل گیا پسند آئیں۔ دل چسپ اور ناقابل یقین کا سلسلہ فوراً بند کردیں۔ کیوں کہ ان باتوں پر یقین نہیں آتا (طیب احمد لاہور)

☆ اسی لیے تو یہ معلومات شائع کی جاتی ہیں کہ ہوتی تو درست ہیں مگر لگتی ناقابل یقین ہیں۔ اڈیٹر

آئیے دوست بنائیں

احسن عدیل 12 سال
خدمت خلق
مکان 392/4 ای بالمقابل جامعہ نذیریہ
گلستان کالونی قینچی امر سدھو لاہور

فاروق احمد وڑائچ 15 سال
کمپیوٹر چلانا
مکان نمبر 205 آئی 10/3
اسلام آباد

عمر احمد صدیقی 13 سال
ڈرائنگ کرنا
142 پی۔ آئی۔ بی۔
کالونی کراچی

عادل جہانگیر خان 14 سال
باغبانی
4/5 ڈی۔ ای 9
اسلام آباد

خرم رفیع ملک 15 سال
کرکٹ
بلاک نمبر 57/8 مکان نمبر 4
کراچی کمپنی اسلام آباد

تیمور بشیر گل 9 سال
پتنگ بازی
واپڈا کالونی کیمپنگ گراؤنڈ فلیٹ
1 جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

محمد عدیل ارشد 14 سال
کرکٹ
رشید احمد چودھری مکان 1306 گلی نمبر
3 سی بلاک نگہبان پورہ فیصل آباد

محمد نوید 15 سال
کرکٹ
مکان نمبر 122 این ای محلہ
فضل آباد راولپنڈی

اویس حفیظ 11 سال
کرکٹ
ڈھوک پیر انفقیر اٹیپو روڈ
راولپنڈی

علی رضا 15 سال
کرکٹ
مکان 1۔ سی 5 بلاک
سٹیلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی

نعمان جاوید 11 سال
فٹ بال، ہاکی
مکان نمبر 50-1 بی مجاہد آباد
جہلم

محمد ریحان قریشی 15 سال
نعت خوانی
1-ای۔ 7/9 ریحان منزل
ناظم آباد نمبر 1 کراچی 18

ظفریاب خان 13 سال
باغبانی
مدینہ بلاک پیر محل ٹوبہ ٹیک
سنگھ

محمد انیس شاکر 14 سال
کرکٹ، ہاکی
مکان نمبر 1806 پشاور

راجا آفتاب گل 12 سال
مطالعہ
26 عسکری 4 نیشنل پارک
روڈ راولپنڈی

عمر فاروق کھوکھر 13 سال
کرکٹ
مکان 280/2 ریلوے روڈ
حویلی لکھا ضلع اوکاڑہ

وجاہت احمد 13 سال
تعلیم وتربیت پڑھنا
کاشانہ مہر مکان نمبر 15/5
دارالنصر غربی اقبال ربوہ

بابر گورچانی 12 سال
قرآن مجید پڑھنا
بلاک نمبر 36 مکان نمبر 38
ڈیرہ غازی خان

عرفان احمد 15 سال
مطالعہ
69/A فیز 1 ہاؤسنگ سوسائٹی
ماڈل ٹاؤن لنک روڈ لاہور

محمد عمر عظیم 13 سال
مطالعہ
273 ریواز گارڈن لاہور

آصف اقبال 12 سال
کرکٹ
کوٹھی نمبر 7-اے بلاک زیڈ
نیو سٹیلائیٹ ٹاؤن سرگودھا

محسن ارشد 12 سال
کرکٹ
870-ڈی سٹیلائیٹ ٹاؤن
راولپنڈی

آئیے دوست بنائیں کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں)

نام .... عمر ....
مشاغل ....
پتا ....
....

صبح کی سیر

1 رضوان علی شاہ، جھنگ صدر (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

2 کرن خورشید درانی، لاہور (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

3 صدف شاہین افضال، لاہور (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

4 عظمیٰ شاہین، بھلوال (چوتھا انعام 45 روپے کی کتابیں)

5 سعدیہ نورین، گوجرانوالہ (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

6 المطرہ فرناز، اڈہ اواگت (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں: سدرہ سلیم لاہور۔ عائشہ خالد سیال کوٹ۔ صائمہ خالد سیال کوٹ۔ وردہ رفیع لاہور۔ نوید اسلم سرگودھا۔ عاتکہ سحر گوندل چونیاں۔ محمد فیاض ریاض شیخوپورہ۔ کرن اسلم بہاول پور۔ اسد محمد لاہور۔ فہیم اقبال فیصل آباد۔ شہزاد سلطان حافظ آباد۔ نوشین افضل منگلا ڈیم۔ زاہد مظہر ذوالفقاری شکردرہ۔ اسما رفیق فیصل آباد۔ سارہ کرن رینالہ خورد۔ محمد عمر یوسف لاہور۔ عنبرین دامان افغانی۔ سعیدہ اسماعیل آباد پکا گڑھا۔ احسن رضا گل لاہور۔ مدحت خان شیخوپورہ۔ عائشہ اقبال سنہ۔ لبنا اسلم بہاول پور۔ صوفیہ اسلم بہاول پور۔ انجم سہیل مغل اوکاڑہ۔ افتخار الرحیم لاہور۔ محمد سرفراز اقبال لاہور چھاؤنی۔ آسیہ تبسم بہاول پور۔ اصغر علی انصاری چک نمبر 159 ای بی۔ کومل مجاہد لاہور۔ راشد سیمی انصاری چک نمبر 159 ای بی۔ عقیل اکرم لاہور۔ آصف کاشف انصاری 159 ای بی۔

آخری تاریخ 17 اکتوبر

آپ بھی لکھیے

وعدہ

زاہدہ پروین، کراچی

"ولید" اباجان نے ولید کو آواز دی جو سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔

"جی.... اباجان" ولید نے پاس آتے ہوئے کہا۔

"ادھر آؤ.... یہاں بیٹھو" اباجان نے ساتھ رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

جب وہ بیٹھ گیا تو اباجان نے کہنا شروع کیا "آج جب تم اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے تھے تو میں تمہیں دیکھ رہا تھا"۔

"جی....؟" ولید نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا لیکن وہ مطمئن انداز میں کہہ رہے تھے "اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آج کھیل وقت سے پہلے کیوں ختم ہو گیا"

ولید کچھ نہ بولا۔ چپ چاپ بیٹھا، نظریں جھکائے اپنی ہتھیلیاں مسلتا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اباجان کے چہرے کی طرف دیکھ لیتا جو بہت پرسکون انداز میں مسکرا رہے تھے۔

"مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت تم کہاں سے کیا کر کے آ رہے ہو؟" اباجان نے گویا دھماکا کیا۔

"یہ اباجان میری جاسوسی کرتے رہتے ہیں کیا؟" اس نے گھبرا کر سوچا۔ بات دراصل یہ تھی کہ آج جب وہ کرکٹ کھیل رہے تھے تو ایک بال پر مخالف ٹیم کے ایک لڑکے نے کہا "آپ آؤٹ ہو گئے ہیں" لیکن ولید نہ آؤٹ ہوا تھا اور نہ ہی اس نے اس لڑکے کی بات مانی۔ لیکن اگلی ہی گیند پر ولید سچ مچ آؤٹ ہو گیا تو وہی لڑکا بولا "دیکھا، مل گئی نا بے ایمانی کی سزا"

ولید جو آؤٹ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی غصے میں تھا اس بات سے آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے کچھ کہے بغیر اپنی پوری قوت سے دو تھپڑ اس کے گال پر مار دیئے۔ وہ لڑکا اس سے عمر میں چھوٹا تھا اس لیے چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس واقعہ کے بعد کھیل بند کر دیا گیا اور سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ لیکن گھر آ کر ولید کو احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی جو بے چارے کو مارا۔ وہ تو اپنی دانست میں سچ ہی بول رہا تھا۔ جتنی دیر وہ گھر میں رہا اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہا۔ آخر اس نے ایک فیصلہ کیا اور اس لڑکے کے گھر جا پہنچا۔ ولید نے اس سے اپنے کئے کی معافی مانگی اور کہا "دراصل مجھے اپنے غصے پر قابو نہیں رہا تھا اس لیے یہ سب کچھ ہو گیا، مجھے بہت افسوس ہے۔ پلیز، مجھے معاف کر دو، غلطی ہو گئی"۔

اس لڑکے نے اسے فوراً معاف کر دیا تھا اور کہا تھا "کوئی بات نہیں بھائی جان آپ تو مجھ سے بڑے ہیں، غلطی میری بھی تھی"۔

اب جب وہ گھر واپس آیا تو اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا رہا تھا تو اباجان نے بلا لیا۔ اباجان بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر انہوں نے اس سکوت کو توڑا "دیکھو بیٹا، غصہ ہر انسان کو آتا ہے لیکن بہادر وہی ہوتا ہے جو اسے پی جائے، میرا خیال تھا کہ اس لحاظ سے تم بہادر ہو لیکن آج مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ لیکن یہ بات مجھے بہت اچھی لگی کہ تم نے اس سے معافی مانگ لی۔ غلطی کا احساس ہو جانا بہت اچھی بات ہے"۔

"مگر اباجان، میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ غصے پر قابو پالوں پر

ایسا نہیں ہوتا" ولید کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"اس کا بہت آسان طریقہ ہے۔ تم اللہ میاں سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم غصے پر قابو پانے کی پوری کوشش کرو گے اور پھر جب کبھی تم غصے میں کوئی غلط قدم اٹھانا چاہو گے تو تمہیں اللہ میاں سے کیا ہوا وعدہ یاد آجائے گا اور تم یقیناً یہ وعدہ نہیں توڑو گے"۔

"ٹھیک ہے اباجان، میں ایسا ہی کروں گا، انشاء اللہ" وہ پرعزم لہجے میں بولا۔ صبح جب وہ اٹھا تو اس کے دل میں ایک عزم تھا۔ غصے کو زیر کرنے کا عزم۔ اسی لیے جب اس کی جماعت کے ایک لڑکے نے اپنے سے چھوٹے بچے کو مارا تو اس نے اسے آرام سے سمجھایا اور اب وہ اسے غصے پر قابو پانے کے طریقے سمجھا رہا تھا جو اس نے بھی رات ہی کو سیکھے تھے (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

غدار

اعتزاز حکیم، لاہور

اماں گلشن باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ اچانک انہیں گل شیر کی آواز سنائی دی "اماں جلدی کریں میرے ساتھی محاذ پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے"

"بس ابھی لائی بیٹا" اماں گلشن باورچی خانے سے بولیں۔ ان کے بیٹے کو دودھ پینے کا بہت شوق تھا جو بچپن سے، اب جب کہ وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا، برقرار تھا۔ اماں نے گلاس میں دودھ ڈالا اور گل شیر کو پکڑا دیا۔ گل شیر اپنی والدہ کے ساتھ سری نگر کے ایک گاؤں میں رہتا تھا جہاں بھارتی فوجیوں نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔

گل شیر کو کچھ پریشان دیکھ کر اماں گلشن بولیں "میرے لعل کیا پریشانی ہے"

گل شیر بولا "اماں بہت دیر ہو گئی ہے۔ میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ آج ہم نے ایک بہت اہم منصوبے پر عمل پیرا ہونا ہے" یہ کہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا، جاتے جاتے اس نے منہ موڑ کر کہا "اماں آپ دعا کریں کہ ہم اپنی سرزمین کو آزاد کرا لیں اور ایک بار پھر آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں"

اپنے بیٹے کی بات سن کر اماں گلشن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے اور وہ بولیں "جاؤ بیٹا میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں" وہ بہت فخر محسوس کر رہی تھیں کہ ان کا بیٹا اپنے شہید والد کا روح رواں جاں نثار ثابت ہوا ہے۔ گل شیر کے والد جان محمد نے اپنے کشمیری ساتھیوں کو بچاتے ہوئے شہادت کا عظیم رتبہ پایا تھا۔ تبھی سے اماں گلشن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو کشمیر کا بہادر سپوت بنائیں گی جو اپنے والد کے مشن کو پورا کر سکے۔

ایک رات اماں گلشن اپنے بیٹے کا انتظار کر رہی تھیں۔ عام طور پر وہ عشاء کی نماز کے بعد آجاتا تھا لیکن آج زیادہ دیر ہو گئی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اماں گلشن بولیں "کون"

آواز آئی "اماں، میں گل شیر اور میرے ساتھ میرے چند ساتھی بھی ہیں"۔

اماں نے جلدی سے دروازہ کھولا چائے بنائی اور گل شیر کے ہاتھ بھیج دی۔ کافی دیر تک کمرے سے آوازیں آتی رہیں۔ اچانک اماں برتن اٹھانے کی غرض سے کمرے کی طرف گئیں تو ان کے کانوں میں مانوس سی آواز پڑی "گل شیر مجاہدین کے خفیہ ٹھکانوں کی خبر ملی؟" یہ آواز تو کرنل راجندر سنگھ کی تھی جسے اماں گلشن پوچھ گچھ کے دوران میں مل چکی تھیں۔ انہیں اپنے بیٹے پر شک ہونے لگا۔ دوسری آواز جو ان کے کانوں میں پڑی وہ ان کے بیٹے کی تھی "کرنل صاحب مجھے ان کے تمام خفیہ ٹھکانوں کی خبر مل چکی ہے اور میں آپ کو خوش خبری سنانے ہی والا ہوں"۔

کرنل راجندر بولا "گل شیر، تم بہت کام کے آدمی ہو اگر تم نے ہمیں صحیح معلومات دیں تو ہم تمہیں اور تمہاری ماں کو پورا تحفظ دیں گے۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں"۔

اماں گلشن کا خواب آنسوؤں کی صورت میں زمین پر بکھرنے لگا اور وہ اندر ہی اندر ٹوٹ گئیں۔ ان کو باہر آتا دیکھ کر اماں باورچی خانے میں چلی گئیں۔ رات کی سیاہی کے ساتھ ان کی سوچ بھی گہری ہوتی گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ان کا بیٹا دشمنوں کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہو گا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ آخر میں کس طرح اپنے وطن کے وقار کو بچا سکتی ہوں۔ آخر انہوں نے

فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنے بیٹے کو ہر قیمت پر روکیں گی۔ چاہے انہیں اپنا سب کچھ کیوں نہ قربان کرنا پڑے۔

صبح ہو چکی تھی۔ اماں باورچی خانے میں گم صم کھڑی دودھ گرم کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے لگ رہا تھا کہ وہ ساری رات روتی رہی ہیں۔ گل شیر نے حسب معمول آواز دی۔ اماں ہاتھ میں دودھ کا گلاس لے کر آہستہ سے باورچی خانے سے نکلیں۔ وہ گل شیر سے یوں مخاطب ہوئیں "بیٹا" مجھے معلوم ہے رات کو تمہارے ساتھ کرنل راجندر آیا تھا اور تم مجاہدین کے خفیہ ٹھکانے تباہ کرنا چاہتے ہو"۔

"ماں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" گل شیر نے کہا۔

"بیٹا، تمہارے والد نے شہادت کا رتبہ پایا تھا، ابھی بھی وقت ہے لوٹ آؤ اور دھرتی ماں کو بچالو"۔

گل شیر نے کہا "اماں اگر آپ کو پتا چل گیا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں چاہتا ہوں تاکہ آپ اور میں سکون سے ظلم اور جنگ سے دور زندگی بسر کریں۔ ہمیں اس جنگ سے کیا لینا دینا! میں صحیح کہ رہا ہوں میری بات سمجھیں"۔

گل شیر کی بات سن کے اماں کا دل کرچی کرچی ہو گیا "یہ ہمارے دشمن ہیں ہمیں سانپ کی طرح ڈس لیں گے" اماں بولیں

"ہونہہ! ڈسیں گے تو ان کو جو ان کے آگے روڑے اٹکائیں گے۔ ہمیں آرام و سکون کی زندگی ملے گی" یہ کہ کر گل شیر نے دودھ کا گلاس پکڑا اور غٹا غٹ پی کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اماں کو کسی کے گرنے کی آواز آئی لیکن یہ آواز اماں کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ جو زہر انہوں نے دودھ میں ملایا تھا اس نے بروقت کام کر دیا ہے۔ انہوں نے دروازے پر پڑی گل شیر کی بے جان لاش کو دیکھا جس کے منہ سے خون کی لکیر نکل رہی تھی۔ اماں کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اوپر اٹھائے اور بولیں "اے مولا" تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے ثابت قدم رکھا کہ میں نے اپنی قوم کی اور شہید شوہر کی لاج رکھ لی۔ بے شک تو بڑی قدرت رکھنے والا ہے"۔ اتنا کہ کر وہ بھی نڈھال ہو کر گر پڑیں (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

جا اپنی حسرتوں پہ....

عبیرہ لطیف، فیصل آباد

ساتھیو، ہماری آپی نے امی حضور کی عدالت میں حاضر ہو کر زبردست دلائل دے کر باورچی خانے میں ہمارا داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا۔

کیوں کہ بقول آپی کے جب بھی ہم باورچی خانے کے دورے پر روانہ ہوتے ہیں تو واپسی پر باورچی خانہ تیسری جنگ عظیم کا نقشہ پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے اور بقول ان کے جو چیزیں بھی ہم ایجاد کرتے ہیں، وہ کھانے کے تو کیا دیکھنے کے بھی قابل نہیں ہوتیں۔

اپنی آپی کا یہ تبصرہ سن کر ہمارا دل خون کے آنسو رو پڑا۔ مگر ساتھیو! وہ کہتے ہیں ناں کہ "ہمت مرداں مدد خدا" بس یہی سوچ کر ہمیں جوش آگیا کہ آخر یہ گھر والے ہمیں سمجھتے کیا ہیں۔ آخر ایک دن جب امی جان بازار گئیں ہوئی تھیں اور آپی ابھی کالج سے تشریف نہیں لائی تھیں کہ ہم نے موقع غنیمت جانا اور ہم بغیر کسی خطرے کے اپنا کارنامہ سرانجام دینے لگے۔ ہم نے کھانا پکانے کی تراکیب والی کتاب ڈھونڈی اور کوئی اچھی سی ترکیب ڈھونڈنے میں مشغول ہو گئے۔ ہماری نظر ایک سویٹ ڈش کسٹرڈ پر پڑی اور آپی تو یہ ہر دوسرے تیسرے دن بناتی رہتیں تھیں۔

"یہ کسٹرڈ شام کو کھانے کے بعد جب میں پیش کروں گی تو سب حیران رہ جائیں گے"۔ ہم نے تصور ہی تصور میں دیکھتے ہوئے سوچا اور اس ترکیب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپی کیا کسٹرڈ بناتی ہیں۔ ہم ایسا کسٹرڈ بنائیں گے کہ سب چمچیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔

مگر افسوس ہمیں یہ نہیں پتا تھا کہ جوتے ہمیں چاٹتے رہ جائیں گے۔ ہم نے فریج سے ڈیڑھ کلو دودھ نکالا اور چولہے پر رکھ دیا کیوں کہ ترکیب میں ڈیڑھ کلو ہی لکھا تھا۔ جب دودھ ابل

چکا تو کسٹرڈ کا پیکٹ نکال کر آرام سے دودھ میں ڈال دیا۔ ہمیں ترکیب غلط محسوس ہوئی۔ کیوں کہ ایک پیکٹ کم لگ رہا تھا۔ ہم نے ایک اور پیکٹ نکال کر پھینٹے بغیر دودھ میں ڈال دیا۔

اب دودھ عجیب مضحکہ خیز صورت حال پیش کر رہا تھا کیوں کہ دودھ میں گلٹیاں سی بن گئیں تھیں مگر ہم نے بھی ہمت نہ ہاری اور زور زور سے چمچ ہلاتے رہے۔ جب چمچ ہلاتے ہلاتے ہمارا بازو جواب دے گیا تو ہمیں چینی کا خیال آیا۔ "ایک پاؤ چینی" اب پاؤ کا تو ہمیں حساب نہ تھا ہم نے چھ چائے کے چمچ ڈال دیئے۔ چینی مکس کر کے ٹھنڈا ہونے پر ہم نے کسٹرڈ ڈش میں ڈال کر فریج میں رکھ دیا۔

ہمیں تو کوئی کمی نہ محسوس ہوئی۔ بس ذرا رنگ گہرا تھا۔ چلو بنایا بھی پہلی دفعہ ہے رنگ گہرا ہو گیا ہے تو کیا ہوا۔ ہم نے خود کو تسلی دی۔ شام کو کھانے کے بعد جب ہم نے کسٹرڈ نکال کر سب کے سامنے پیش کیا تو ہمارے تصور کے مطابق سبھی حیران رہ گئے۔ "واہ بھئی عیبرہ تم نے تو کمال کر دیا" ابو نے داد دی۔

"رنگ کچھ گہرا ہے" آپی نے حسب سابق تنقید کی۔ "بنایا بھی تو پہلی دفعہ ہے"۔ ہم نے اپنا دفاع کیا۔ آپی نے چمچ اٹھا کر ڈش میں سے کسٹرڈ نکالنا چاہا مگر وہ تو ایسے لگ رہا تھے جیسے گوند کے ساتھ چپکا دیا ہو۔

"ارے اتنے آرام سے تو آپ نکال رہی ہیں۔ ایسے بھلا کیسے نکلے گا؟ لائیں میں نکال کر دوں" مگر جب ہم نے نکالنے کی کوشش کی تو وہ واقعی کافی سخت تھا۔ خیر ہم نے زور لگا کر کسٹرڈ نکال ہی لیا۔

آپی نے جب چمچ سے توڑ کر وہ منہ میں رکھا تو انہوں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے جیسے ان کے کانوں سے دھواں نکل رہا ہو۔

ساتھیو، یہ حقیقت تو ہم پر بعد میں آشکار ہوئی کہ جو چھ چمچ چینی سمجھ کر ڈالے تھے وہ آئیوڈین ملا دانے دار نمک تھا۔ اب ہماری نظر امی حضور کے جوتے پر تھی جو کم بخت خاصا بے لگام ہو چکا تھا اور امی حضور کی نظریں ہمارے اوپر مرکوز تھیں۔ اور ہم یہ بے ساختہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

جا اپنی حسرتوں پہ "چھتر" کھا کے سوجا....

ساتھیو! اگر ہم امی جان کی اجازت سے آپی کی نگرانی میں بناتے تو شاید ہماری پہلی کوشش کام یاب ہو جاتی مگر ہم تو خود ہی پھنے خاں بننے پر تلے ہوئے تھے۔ جس کا انجام ہمیں بہت مہنگا پڑا۔ (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

خوف کی وہ سیر

انجم سہیل مغل، اوکاڑہ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے میٹرک کا امتحان دے رکھا تھا۔ اب سامنے 3 ماہ فارغ نظر آ رہے تھے۔ پڑھائی کے دنوں میں تو گھر والوں کی طرف سے مارشل لاء لگا ہوا تھا۔ زیادہ تفریح کے مواقع ہاتھ نہیں لگتے تھے۔ عشاء کے بعد گھر سے نکلنا جرم کے مترادف تھا۔ لیکن اب چوں کہ کچھ عرصہ کے لیے پڑھائی کی ذمہ داری سے خلاصی ہو گئی تھی اس لیے پابندیوں میں خود بخود کچھ لچک آ گئی تھی۔ یہ واقعہ انہی دنوں کا ہے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یعنی امتحانوں کے بعد کا "سہیل بیٹا! یہ لو پیسے اور صبح ٹیلی فون کا بل ادا کر آنا" ابو نے مجھے 3000 روپے دیتے ہوئے کہا۔ میں نے روپے لے کر جیب میں رکھ لیے اور سو گیا۔

رات کو میں اپنے دوست کاشی کے ساتھ سیر کی غرض سے جناح پارک گیا۔ وہاں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ پارک کی بتیاں بند ہیں۔ ہمارا موڈ آف ہو گیا۔ کیوں کہ اسی وجہ سے وہاں چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی۔ بہرحال معلوم کرنے پر پتا چلا کہ پارک کا ٹرانسفارمر جل گیا ہے اور کچھ دن اسی طرح پارک میں اندھیرا رہے گا۔

خیر ہم برگر والے کے پاس آئے اور اسے 2 برگر کا آرڈر دے کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ "یہ لیں جناب برگر!" برگر والے نے مجھے برگر پکڑاتے ہوئے کہا۔ میں نے برگر پکڑ کر اپنے دوست کو پکڑائے اور جیب میں سے روپے نکالنے کے لیے ہاتھ

ڈالا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے تو آج ابو سے جیب خرچ ہی نہیں لیا تھا۔ لیکن اچانک مجھے یاد آیا کہ میری زپ والی جیب میں 3000 روپے موجود ہیں۔ میں نے 1000 کا نوٹ نکال کر برگر والے کو دیا اور اس نے مجھے بقایا پیسے دیئے جو میں نے لے کر جیب میں رکھ لیے اور ہم پارک میں موجود سیمنٹ کی میز پر بیٹھ کر برگر کھانے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

"جناب! یہاں لائٹ کیوں بند ہے؟" ایک بڑی مونچھوں والے شخص نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ اس آدمی کی طرف دیکھتے ہی کاشی پر خوف سا طاری ہو گیا۔ بہر حال میں نے اس آدمی کو اس کے سوال کا جواب دے دیا اور بعد میں کاشی سے پوچھا۔

"یار کاشی، تم اس آدمی کو دیکھ کر گھبرا کیوں گئے تھے؟"

"یار! تم نے ہزار کا نوٹ برگر والے کو دیا تھا تو اس وقت سے اس آدمی کی نظریں تمہاری زپ والی جیب پر تھیں۔ اس کے ساتھ ایک ڈاڑھی والا شخص بھی تھا۔ مجھے اس وقت یہ بہت مشکوک لگا تھا۔ اب یہ شخص میرے شک کو یقین میں بدل گیا ہے۔ یقیناً اس کی نیت میں کوئی فتور ہے"۔

"ہوں" میں نے ساری بات سمجھتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے کاشی سے کہا "ہم باہر والی مین سڑک سے واپس جائیں گے۔ کیوں کہ وہاں کافی روشنی اور چہل پہل ہوتی ہے۔ چناں چہ ہم وہاں سے اٹھے اور برگر کھاتے کھاتے مین سڑک پر پہنچ گئے۔

جب ہم سڑک کے عین بیچ میں پہنچ گئے تو وہی بڑی بڑی مونچھوں والا شخص ہمارے آگے سے اور ڈاڑھی والا شخص ہمارے پیچھے سے نمودار ہوا۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہم پر خوف کے سائے منڈلانے لگے۔ ابھی ہم کچھ سوچنے ہی لگے تھے کہ اچانک ایک کار کے بریک ہمارے قریب آکر چرچرائے۔ اس حالت میں ہم بے ہوش ہوتے ہوتے سنبھلے کیوں کہ کار میں کوئی مشکوک شخص نہیں بلکہ ہمارا دوست حماد تھا۔ ہم بغیر بات کیے گاڑی میں بیٹھے اور حماد کو گاڑی اسٹارٹ کرنے کو کہا۔ حماد نے ہمارے حواس کو دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم نے سکون محسوس کیا۔ وہ دونوں شخص ہماری طرف دیکھ رہے تھے لیکن اب ہم کہاں ہاتھ آنے والے تھے۔ اس دن اگر حماد نہ آتا تو وہ سیر سکون کی نہیں بلکہ مصیبت کی سیر ہوتی۔ اس واقعہ سے جو ہمیں پریشانی ہوئی وہ تو ہوئی لیکن ہمیں یہ سبق مل گیا کہ پیسوں کی نمائش نہیں کرنی چاہیے (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

ڈراؤنی رات

نازش اکرم، راولپنڈی

دسمبر کی طوفانی رات تھی۔ تھوڑے وقفے کے بعد بجلی کی کڑک سنائی دے رہی تھی۔ وقفے سے بارش ہو رہی تھی۔ سب گھر والے سو رہے تھے۔ لیکن میں اپنے سالانہ امتحان کی تیاری کی وجہ سے جاگ رہی تھی۔ اچانک میرے بیڈ روم کے ساتھ والے اسٹور کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ میری اتنی ہمت نہ ہوئی کہ میں بیڈ سے اتر کر باہر بھاگ جاتی۔ میں بیڈ پر بیٹھی اپنے آخری وقت کا انتظار کرنے لگی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے ابھی کوئی چڑیل تیزی سے اسٹور میں سے نکلے گی اور مجھے کچا چبا جائے گی۔ اکثر سننے میں آیا تھا کہ آیت الکرسی کا ورد کرنے سے چڑیلیں بھاگ جاتی ہیں۔ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں ورد کرنا شروع کر دیا۔ کافی دیر گزر گئی دروازہ بدستور ادھ کھلا رہا۔ آخر میرے اندر جاسوسی کی حس پھڑکی۔ میں آرام سے بیڈ سے اتری اور اسٹور کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی اسٹور کا دروازہ چند فٹ دور ہی تھا کہ زور سے بجلی کڑکی اور ساتھ ہی اسٹور کا دروازہ کھلا پھر اس میں سے کوئی جانور تیزی سے نکل کر بیڈ کے نیچے جا چھپا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور بیڈ کے نیچے جھانکا تو بیڈ کے کونے میں دو چمکیلی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ پھر اچانک وہ آنکھیں میری طرف بڑھنا شروع ہوئیں۔ آہستہ آہستہ وہ آنکھیں اور قریب آتی گئیں۔ اب ایک جانور بھی نظر آرہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ

چہرے پر رکھ لیے۔ میں چیخ چیخ کر سب کو بلانا چاہتی تھی لیکن میری آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ اچانک کسی نے میرے پیروں کو چاٹنا شروع کر دیا۔ بس پھر کیا تھا؟ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ پہلے یہ مجھے چکھ رہا ہے پھر مجھے چیر پھاڑ کر کھا لے گا۔ پھر میں نے سوچا کیوں نہ بھاگنے کی آخری کوشش کر لی جائے۔ اگر یہاں سے بچ گئی تو اللہ کا کرم ورنہ اس بلا کا نوالہ بننا تو ہے ہی۔ جونہی میں نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے میں جہاں کھڑی تھی وہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ کیوں کہ میرے قدموں میں کوئی بلا نہیں بلکہ ہماری پالتو بلی ”مانو“ بیٹھی ہوئی تھی اور مسلسل میرے پاؤں چاٹ رہی تھی۔

صبح یہ واقعہ میں نے سب گھر والوں کو سنایا تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ مانو اندر کیسے گئی۔ آخر مجھے ہی یاد آیا کہ مانو تو رات کے وقت صحن میں پھرتی تھی لیکن اس دن سر شام ہی بارش شروع ہو گئی تھی جس کی وجہ سے مانو میرے کمرے میں گھس گئی۔ اسٹور کا دروازہ کھلا ہوا تھا لہٰذا وہ اسٹور میں چلی گئی۔ جب میں کمرے میں گئی تو میں نے اسٹور کا دروازہ بند کر دیا لیکن چیزیں زیادہ ہونے کی وجہ سے اسٹور پورا بند نہ ہو سکا اور پھر بعد میں جو ہوا اس کے کیا کہنے۔ ویسے اب میں ہمیشہ اسٹور کے دروازے کو اچھی طرح بند کر کے پڑھتی ہوں (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

ڈنڈا پیر

محمد طاہر سلیم پل دولے والا

میں اس حصے کی طرف جا رہا تھا جہاں پر کرسیوں کے اوپر …ت سے لوگ مضطرب حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی آج … گھنٹا لیٹ تھی۔ میں بھی ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ سامنے ایک …احب پان کھا رہے تھے۔ انہوں نے کمال بہادری کا مظاہرہ …رتے ہوئے زور دار طریقے سے پچکاری میری شلوار کے پائنچے …ماری۔ میں سٹ پٹا سا گیا۔ ان صاحب نے میری طرف دیکھا اور عجیب سے انداز میں ہنس کر بولے ”معاف کیجئے گا میں نے دیکھا نہیں تھا“۔

میں چپ رہا۔ اب بھلا میں بولتا بھی کیا۔ میرے کپڑوں کا ستیاناس کر کے بات دو لفظوں میں ختم کر ڈالی۔ کوئی سگرٹ پی رہا تھا تو کوئی کیلے کھا کر چھلکے فرش پر پھینک رہا تھا۔ پھر ٹکٹ کھلنے کی گھنٹی بجی۔ سب لوگ بے تاب ہو کر اس طرف لپکے جس طرف کھڑکی تھی۔ میں بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ ایک عجیب منظر تھا۔ سب لوگ کھڑکی کے دروازے پر ایسے چمٹے ہوئے تھے جیسے مکھیاں پیسٹری پر چمٹی ہوں۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ ٹکٹ لے کر پہلے پلیٹ فارم پر چلا جائے۔ ایک ہی وقت میں چار چار ہاتھ چھوٹے سے سوراخ میں سے اندر بڑھے ہوئے تھے۔ خوب شور مچا ہوا تھا۔ ایک دوسرے کو دھکے لگ رہے تھے۔

میں یہ منظر دیکھ کر بڑا دکھ محسوس کر رہا تھا۔ کیوں کہ ان میں ایسے بھی لوگ تھے جو پڑھے لکھے محسوس ہوتے تھے۔ مگر وہ بھی بالکل ان پڑھوں کی طرح مکمل طور پر دھینگا مشتی میں مصروف تھے۔ اچانک سامنے سے ایک لمبی لمبی مونچھوں والا سپاہی ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ڈنڈا پکڑے نمودار ہوا۔ اس نے آتے ہی بارعب آواز میں کہا ”چلو قطار میں کھڑے ہو جاؤ ورنہ اندر کر دوں گا“۔

بس پھر کیا تھا۔ سب نے کسی مہذب مدرسے کے طالب علموں کی طرح بالکل سیدھی لائن بنا لی۔ ایسا لگتا تھا کہ اچانک اس بکھرے ہوئے گروہ میں تہذیب واپس آ گئی ہے اور سب بڑے سکون سے ٹکٹ لے رہے تھے۔

مجھے اپنے معاشرے کی یہ تصویر دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ کیوں کہ اس جدید دور میں بھی ہم ڈنڈے کو پیر مانتے ہیں۔ اگر اس سپاہی کے آنے سے پہلے وہ لوگ قطار بنا لیتے تو کون سی قیامت آجاتی۔ بہت سی ایسی دوسری جگہوں پر بھی ایسے ہی منظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہمیں اس برائی کا سدباب کرنا ہو گا۔ (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

کرِپس مشن

1942ء

سر رچرڈ سٹیفورڈ کرپس

ان دنوں جنگ عظیم زوروں پر تھی جنگی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے برطانوی حکومت کو ہندوستان سے مدد لینا اشد ضروری تھا، چنانچہ برطانوی وزیر اعظم چرچل نے سر رچرڈ سٹیفورڈ کرپس کو تجویز دے کر ہندوستان بھیجا اس میں ہندوستانیوں سے دو بڑے بڑے وعدے کیے گئے :

1 - ہندوستان میں کوئی ایسا آئین نافذ نہیں کیا جائے گا جسے ملک کا کوئی بڑا طبقہ منظور نہ کرتا ہو۔

2 - جنگ کے اختتام پر آئین سازی کا مسئلہ ہندوستانی نمائندے ہی طے کریں گے اور ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دیا جائے گا۔

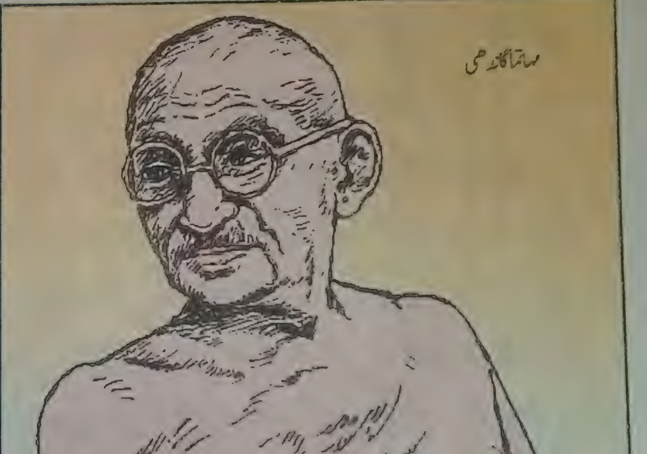

مگر گاندھی جی نے انگریزوں سے کہا کہ وہ ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں۔

QUIT INDIA

جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت ہندوستان کے حوالے کر دیجئے

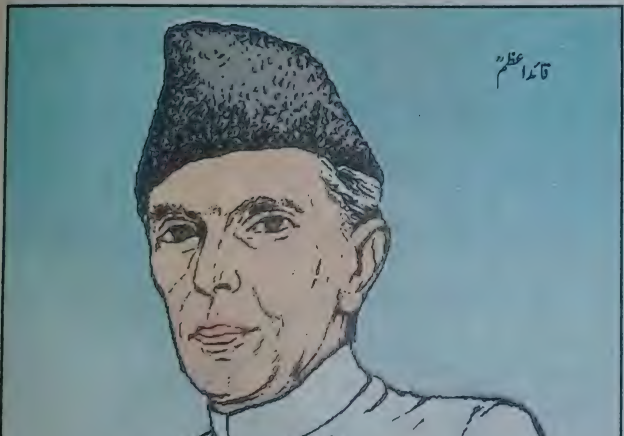

لیکن قائدِ اعظمؒ نے فوری مطالبہ کیا کہ :-

DIVIDE AND QUIT INDIA

یعنی پہلے ہندوستان کو تقسیم کریں اور پھر چلے جائیں۔

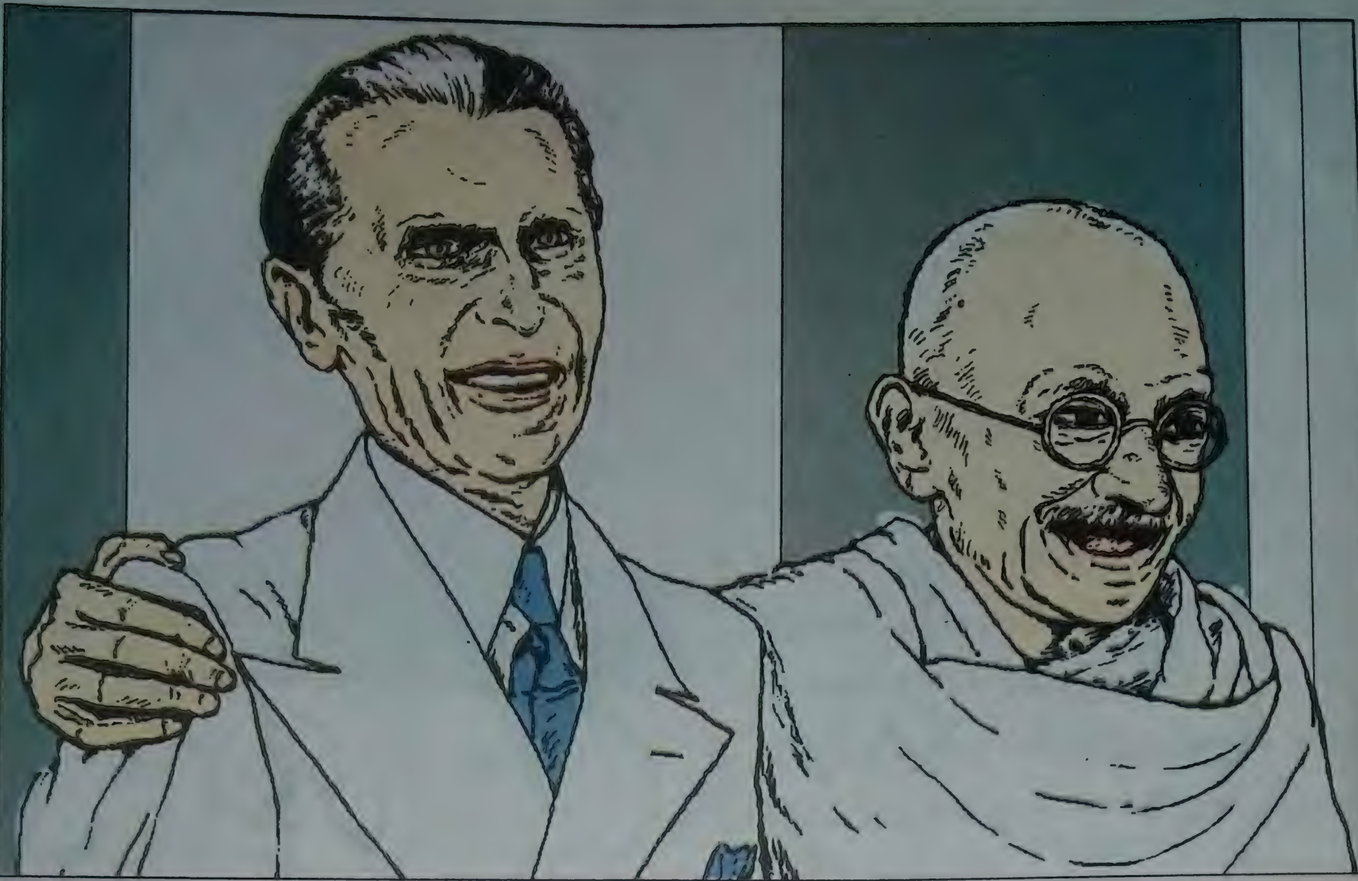

جناح ،گاندھی مذاکرات 1944ء

گاندھی جی نے قائدِ اعظمؒ کے نام ایک خط میں ہندو مسلم تنازعات کے حل کی خاطر ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا جسے قائدِ اعظمؒ نے فوراً قبول کر لیا۔ یہ ملاقات 9 ستمبر 1944ء میں بمبئی میں قائدِ اعظمؒ کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ اس کے بعد مزید خط وکتابت بھی جاری رہی۔مگر 27 ستمبر 1944ء کو مذاکرات کی ناکامی کا اعلان کر دیا گیا۔

وجوہات :۔

1۔ گاندھی جی ہندو مفادات کے خلاف کوئی بات سننے پر تیار نہ ہوئے

2۔ گاندھی جی نے زیادہ گفتگو نجی حیثیت میں کی۔

3۔ قائدِ اعظمؒ نے کہا پہلے باہمی مسئلے طے ہونے چاہئیں اور پھر تیسری طاقت یعنی انگریزوں کا اخراج ہو۔

4۔ گفت وشنید اور خطوط میں ابتدا میں سی آر فارمولا پر بات ہوئی جس کے مطابق گاندھی جی دو قومی نظریے کے منکر اور قائدِ اعظمؒ اس کے وکیل تھے۔

جناح گاندھی مذاکرات کی ناکامی در اصل مسلم لیگ کی کامیابی تھی کیونکہ اس سے تقسیم ہند کے شدید مخالف گاندھی جی کم ازکم قائدِ اعظمؒ سے ملاقات اور گفتگو کرنے پر آمادہ تو ہوئے۔

گناہ کی سزا

پانچویں قسط

سید نظر زیدی

چھوٹا قسطانی اور توصیف کئی گھنٹے آوارہ گردی کرنے کے بعد گھر لوٹے تھے اور بہت خوش تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ کار لے کر نکل جاتے تھے اور یونہی بے مقصد ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے۔ اس دوران میں انہیں شرارتیں بھی بہت سوجھتی تھیں۔ کبھی پیدل چلتے ہوئے مسافروں کے بالکل پاس پہنچ کر زور سے ہارن بجا کر ڈرا دیتے، کبھی ٹریفک کے اشارے کو نظر انداز کر کے سپاہی کو منہ چڑاتے ہوئے بھاگ نکلتے اور کبھی کسی سائیکل سوار کو گرا دیتے۔

توصیف دل کا برا نہ تھا۔ اپنے خاندان کی بہت خوبیاں اس کے اندر تھیں لیکن قسطانی کی صحبت میں رہنے سے اس کے دل پر تاریکی چھا گئی تھی اور وہ بھی ان شرارتوں میں دل چسپی لینے لگا تھا۔ گویا وہ بات سچ ثابت ہوئی تھی کہ آگ کے پاس بیٹھنے سے کپڑے ضرور جلتے ہیں اور کوئلوں کی دلالی میں منہ ضرور کالا ہوتا ہے۔

آج ان دونوں نے یہ شرارت کی تھی کہ ایک غریب آدمی کو اپنی موٹر میں بٹھا کر اس کے گھر پہنچا دینے کا لالچ دے کر شہر سے تین چار میل دور اجاڑ جگہ چھوڑ آئے تھے اور اپنے اس گناہ کو اپنا بہت بڑا کارنامہ سمجھ کر خوش ہو رہے تھے۔

کوٹھی پہنچ کر موٹر سے اترے تو چھوٹا قسطانی ہنستے ہوئے بولا ”یار توصیف! آج تو واقعی لطف آگیا۔ میرا خیال ہے وہ کاٹھ کا الو آج کی تاریخ میں تو اپنے گھر پہنچ نہیں سکتا۔ چلا تھا موٹر کی سیر کرنے!“

”لیکن قسطانی یار، میرا تو خیال ہے ہم نے یہ کچھ اچھا نہیں کیا۔ غریبوں کو ستانا سخت گناہ ہے۔ ایسی باتوں سے اللہ بہت ناراض ہوتا ہے“۔ توصیف نے افسوس بھری آواز میں کہا۔

یہ بات بالکل ٹھیک تھی لیکن چھوٹے قسطانی پر اس کا بالکل اثر نہ ہوا۔ وہ منہ بنا کر بولا ”یار یہی بات مجھے سخت ناپسند ہے کہ تم کبھی ان ذلیل اور کمینے لوگوں کی بڑائیاں بیان کرنے لگتے ہو۔ تم کہتے ہو ان لوگوں کو ستانے سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور ہم کہتے ہیں انہیں ستانے سے خدا خوش ہوتا ہے“۔

”وہ کیوں؟“ توصیف نے حیران ہو کر سوال کیا۔

”وہ اس لیے کہ یہ لوگ سخت گندے اور بدتمیز ہوتے ہیں اور ان کی عادتیں ایسی خراب ہوتی ہیں کہ کوئی شریف آدمی انہیں پسند نہیں کر سکتا۔ ذرا وہ اپنی گھڑی کی چوری والا واقعہ ہی یاد کرو!“ چھوٹے قسطانی نے کہا۔ پھر کچھ دیر رک کر بولا ”تم کہہ رہے تھے ان لوگوں کے گھر کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ کیا تلاشی میں گھڑی نہیں ملی؟“

”گھڑی تو تب ملتی جب کوئی تلاشی لیتا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے ہمارے بھائی صاحب ان دنوں جنت میں محل تیار کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے ان کے لاڈلے کلو اور للو کے گھر کی تلاشی کون لے سکتا ہے!“ توصیف نے افسردہ ہو کر جواب دیا۔

”اگر کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا تو میں کرنے کو تیار ہوں اور اسی وقت کرنے کو تیار ہوں۔ میرا تو خیال ہے ابھی چلتے ہیں اور ان چوٹوں کے گھر کی تلاشی لے کر اپنی گھڑی برآمد کرتے ہیں!“ قسطانی جوش بھری آواز میں بولا۔

دل تو توصیف کا بھی یہی چاہتا تھا کہ اسی وقت جا کر کلو اور

للو کے گھر کی تلاشی لے لیکن توحید کے ناراض ہو جانے کے خیال سے رک گیا۔ کہنے لگا "نہیں بھئی! یہ کام ہمارے کرنے کا نہیں۔ اباجان جس طرح مناسب سمجھیں گے کریں گے"۔

"اور بالکل اطمینان رکھو تمہارے اباجان قیامت تک اس بارے میں کچھ نہیں کریں گے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے انعام کے طور پر کچھ بھیج دیں۔ چھوٹے قسطانی نے کہا۔ پھر اکرم اپنے پنجوں پر گھوم کر چٹکی بجاتے ہوئے بولا "بھئی توصیف! چاہے تم ناراض ہو جاؤ لیکن میں تو یہ کام اسی وقت کرنا چاہتا ہوں۔ تم ساتھ چلو یا نہ چلو! اس وقت میرا موڈ بہت اچھا ہے۔ ایسے شان دار طریقے سے ان چوروں کے گھر کی تلاشی لوں گا کہ سات پشتوں کی چوریاں ظاہر ہو جائیں گی۔ لو میں چلا!" چھوٹے قسطانی نے جوش بھری آواز میں کہا اور اس سے پہلے کہ توصیف کچھ کہتا، موٹر کی چابی انگلی میں گھماتا اور منہ سے سیٹی بجاتا ہوا گیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

کچھ لاڈ پیار اور کچھ اس خیال نے کہ میں امیر ماں باپ کا بیٹا ہوں، چھوٹے قسطانی کو بہت ہی ضدی اور مغرور بنا دیا تھا۔ غریبوں کو تو وہ کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ ایک غریب مزدور کے گھر کی تلاشی لینا اس کے نزدیک نہایت معمولی بات تھی۔ اس کا خیال تھا میری صورت دیکھتے ہی وہ سب گھبرا جائیں گے اور میں ان کا سامان الٹ پلٹ کر کے چرائی ہوئی گھڑی تلاش کر لوں گا۔

وہ اس قسم کی باتیں سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اس کی نگاہ کلو پر پڑی جو اپنے کرتے کے دامن میں کوئی چیز لیے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس غریب بچے کو دیکھ کر چھوٹے قسطانی کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے کچھ سوچ کر رعب دار آواز میں کہا "او کلو کے بچے، کہاں جا رہا ہے؟"

یہ بات سن کر کلو رک گیا اور چھوٹے قسطانی کو نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "میں کلو کا بچہ نہیں ہوں جناب بلکہ خود کلو ہوں! کیا آپ کو مجھ سے کچھ کام ہے؟" تھوڑی سی تعلیم حاصل کر کے اس میں حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔

"کیا تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ تجھ سے بھی کسی کو کچھ کام ہو سکتا ہے؟" چھوٹے قسطانی نے غصے بھری آواز میں کہا۔ وہ

کلو کا یہ مزے دار جملہ سن کر شرمندہ ہو گیا تھا۔

کلو نے پہلے کی طرح تیز آواز میں کہا "پھر آپ نے مجھے آواز کیوں دی تھی؟"

"تیرا دماغ درست کرنے کے لیے!" چھوٹا قسطانی کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ لیکن کلو اس کے رعب میں بالکل نہ آیا۔ پہلے کی طرح بے پروائی کے انداز میں بولا "میرا دماغ خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہے جناب! بیمار تو کچھ کچھ آپ لگ رہے ہیں جو بے وجہ ناراض ہو رہے ہیں مجھ پر"۔

"معلوم ہوتا ہے سچ مچ چیونٹی کے پر نکل آئے ہیں۔ جانتا ہے جب چیونٹی کے پر نکل آئے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟" چھوٹا قسطانی اب غصے سے بے قابو ہو گیا تھا۔ بات ختم کر کے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر لیں اور کلو کو دکھاتے ہوئے بولا پھر اس کی موت آ جاتی ہے اور اسی طرح تیری موت بھی تجھے آوازیں دے رہی ہے جو یوں بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا ہے"۔

"اور میرا خیال ہے موت ان کی آ رہی ہے جنہیں اچھے

بھلے انسان چیونٹیاں نظر آرہے ہیں!" کلو نے بھی کراری آواز میں جواب دیا۔

اس کی یہ بات سن کر چھوٹا قسطانی کے تان کر اس کی طرف بڑھا لیکن عین اسی وقت ایک تیز رفتار ٹیکسی ان دونوں سے ذرا فاصلے پر آکر رک گئی اور تین چار موٹے موٹے آدمی اس میں سے اتر کر چھوٹے قسطانی کی طرف بڑھے۔ کلو کی طرف انہوں نے بالکل دھیان نہ دیا۔ میلے کپڑوں کی وجہ سے وہ شاید انہیں نظر ہی نہ آیا تھا۔

یہ جگہ جہاں اس وقت یہ لوگ کھڑے تھے صدیقی صاحب کی کوٹھی اور کچی بستی کے تقریباً درمیان میں تھی اور چوں کہ اس طرف عام لوگوں کا آنا جانا بالکل نہ تھا اس لیے آس پاس کوئی آدمی دکھائی نہ دیتا تھا۔ بستی کے تھکے ہارے مزدور شام ہوتے ہی اپنے گھروں میں سما جاتے تھے۔ ان میں سے اگر کوئی باہر نکلتا بھی تھا تو بہت ہی ضرورت کے وقت۔ جیسے کلو اس وقت کوئی سودا لینے گھر سے نکلا تھا۔ رہ گئے کوٹھیوں کے رہنے والے' تو ان میں سے شام کے بعد چھوٹا قسطانی اور اس کے والد قسطانی صاحب باہر آتے تھے اور وہ بھی کلب جانے کے لیے۔

چھوٹے قسطانی کے پاس آکر ایک طاقت ور غنڈے نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور رعب دار آواز میں کہا "خبردار! اگر تیرے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نکلی! اگر زندگی چاہتا ہے تو جو ہم کہیں اس پر عمل کر!"

غنڈے کی یہ بات سن کر چھوٹے قسطانی کا تو رنگ اڑ گیا۔ اس نے آج تک صرف کم زوروں اور غریبوں پر رعب جمایا تھا۔ طاقتوروں سے تو اس کا واسطہ آج پہلی بار پڑا تھا۔ ذرا سی دھمکی ہی میں اس کا یہ حال ہو گیا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں!

کلو اگرچہ پڑھا لکھا تھا لیکن ان غنڈوں کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ خطرناک لوگ ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ سب کے سب چھوٹے قسطانی کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں تو وہ پوری رفتار سے ٹیکسی کی طرف بھاگا اور جلدی سے اس کے نیچے گھس گیا۔ اس کھلے میدان میں صرف یہی ایک جگہ تھی جہاں وہ چھپ سکتا تھا۔

ادھر چھوٹا قسطانی جب غنڈوں کے رعب میں آگیا تو انہوں نے جلدی جلدی اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا اور ایک مضبوط رسی سے دونوں ہاتھ جکڑ کر یوں کندھے پر اٹھا لیا جیسے مزدور گندم کی بوری اٹھاتے ہیں اور تیزی سے ٹیکسی کی طرف بڑھے۔

کلو ٹیکسی کے پچھلے پہیوں کے درمیان میں اس طرح بیٹھا تھا کہ اگر اسے چلایا جائے تو اسے ذرا بھی چوٹ نہ لگے۔ وہ وہاں چھپا ہوا غنڈوں کی ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

چھوٹے قسطانی نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی وجہ سے اس کا یہ حال دیکھ کر اسے خوشی ہونی چاہیے تھی لیکن وہ بہت سمجھ دار اور نیک دل لڑکا تھا۔ اس لیے چپکے چپکے خدا سے یہ دعا مانگ رہا تھا کہ کسی طرح اس کے اس دشمن کی ان سے جان بچ جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس سلسلے میں اسے کچھ کرنا چاہیے! اس نے چھوٹے قسطانی کی مدد کرنے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا۔

غنڈوں نے چھوٹے قسطانی کو پچھلی سیٹ پر پھینک دیا اور جلدی جلدی ٹیکسی میں سوار ہو گئے تو کلو فوراً باہر نکل آیا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ڈگی کھول کر اس میں گھس گیا اور اس کے ساتھ ہی ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی ایک طرف روانہ ہو گئی۔

کوئی آدھے گھنٹے تک اسی طرح تیزی سے دوڑانے کے بعد ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی۔ غنڈے جلدی سے باہر نکل آئے اور چھوٹے قسطانی کو نکال کر ایک مکان میں لے گئے۔ ٹیکسی کے رکتے ہی کلو نے بھی باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ ڈگی کا ڈھکنا ذرا سا اونچا کر کے غور سے دیکھ رہا تھا کہ ٹیکسی کس جگہ رکی ہے۔

یہ ایک تاریک سی گلی تھی جس کا سرکاری کھمبے کا بلب بھی روشن نہ تھا۔ یہ اس محلے کا ایک ایسا ہی اجاڑ سا حصہ تھا جیسا توحید کی کوٹھی اور کچی بستی کے درمیان تھا۔ ہاں دوسری طرف کافی دور تک آبادی پھیلی ہوئی تھی اور کافی رونق نظر آتی تھی۔ وہ اس جگہ کی پہچان کر کے باہر نکل آیا اور دوڑ کر بجلی کے کھمبے کے ساتھ یوں چمٹ کر بیٹھ گیا کہ دور سے بالکل نظر نہ آتا تھا۔

پندرہ بیس منٹ اس طرح گزر گئے پھر سب غنڈے باہر نکلے اور ٹیکسی کے پاس آکھڑے ہوئے۔ اب وہ بہت زیادہ خوش نظر آرہے تھے اور خاصی اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک غنڈہ بولا "لے بھئی کراچی والے اب تو اپنی ٹیکسی کو جلدی سے سمن آباد لے جا اور اس کے چاروں ٹائر اور نمبروں والی پلیٹ بدل دے اور چار پانچ دن چین کی بنسی بجا۔ امید ہے اتنے دنوں میں پھر اس شکار کو محفوظ جگہ پہنچا دیں گے"۔

"بہت اچھا استاد! ویسے اگر آپ کہیں تو کل پرسوں تک ایک چکر لگا جاؤں؟" کراچی والے نے سوال کیا۔

"بالکل نہیں، شاید تجھے اندازہ نہیں میرے یار کہ یہ کتنا موٹا شکار ہے۔ اس بے ایمان قسطانی کو جیسے ہی معلوم ہو گا کہ اس کا بیٹا غائب کر دیا گیا ہے سارے شہر میں طوفان مچا دے گا۔ کیوں رمضانی یہ بات ٹھیک ہے ناں؟" اس غنڈے نے کہا جسے دوسرے غنڈے استاد کہتے تھے۔

رمضانی جلدی سے بولا "یہ بات تو پکی ہے استاد جی! اس سلسلے میں تو ہمیں بہت زیادہ احتیاط برتنی ہو گی"۔

"اچھا اب رخصت، باقی باتیں پھر ہوں گی۔ سب اپنے اپنے ٹھکانے کی طرف بھاگو! میں رمضانی اور پھکڑ پرسوں تک یہیں رہیں گے اور اس کے بعد راول پنڈی والے اڈے پر پہنچ جائیں گے۔ تم سب بھی وہیں پہنچ جانا!" استاد نے کہا اور اس کے بعد استاد رمضانی اور پھکڑ تو مکان میں چلے گئے اور باقی ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

کلو نے اب یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ یہ ان غنڈوں کا خطرناک گروہ ہے جو ڈاکے ڈالتا اور بچوں کو اغوا کرتا ہے۔ ان کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر تک اسی طرح گم سم کھمبے سے لگا بیٹھا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس مکان کے سامنے آکھڑا ہوا جس میں چھوٹے قسطانی کو لے جایا گیا تھا۔ یہ ایک بالکل نیا دو منزلہ مکان تھا جو باہر سے بھی نہایت خوش نما نظر آتا تھا اور اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی تعمیر پر کافی روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔

اس مکان پر بورڈ تو کوئی نہ تھا لیکن اس کی چوکھٹ پر پکا نمبر ضرور لگا ہوا تھا۔ کلو اتنے دن کی تعلیم ہی میں ہندسے لکھنا اور پڑھنا اچھی طرح سیکھ گیا تھا۔ اس نے یہ نمبر اچھی طرح یاد کر لیا۔ پھر گلی کے نکڑ پر آکر گلی کا نمبر بھی یاد کر لیا۔ یہ دونوں نمبر پڑھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی اور اس نے اپنے طور پر یہ بات طے کر لی کہ ان غنڈوں کا پتا معلوم ہو گیا ہے اس لیے انہیں گرفتار کرایا جا سکے گا۔ لیکن جب اسے محلے کا خیال آیا کہ یہ محلّہ کون سا ہے تو ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ کیوں کہ انتہائی کوشش کے باوجود وہ یہ بات معلوم نہ کر سکا کہ یہ کون سا علاقہ اور کون سا محلّہ ہے۔

اس سلسلے میں کافی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد آخر میں اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اب صبح ہونے پر معلوم کرنا چاہیے کہ یہ محلّہ کون سا ہے؟ چنانچہ وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آگیا اور صبح کے انتظار میں ایک دکان کے تھڑے پر لیٹ گیا۔

تھکان کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیوں کہ اس نے محنت مشقت کا کوئی کام نہ کیا تھا۔ لیکن خوف کی وجہ سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ اگر اسے یہ بات معلوم ہو جاتی کہ وہ شہر کے کون سے حصے میں ہے تو یقیناً اس وقت اپنے گھر کی طرف روانہ

ہو جاتا۔

کلو نے نہ مار دھاڑ کی وہ فلمیں دیکھی تھیں جن میں جاسوسوں اور ڈاکوؤں کے زور دار مقابلے دکھائے جاتے ہیں اور نہ جاسوسی ناول ہی پڑھے تھے لیکن وہ ایک بہادر اور سمجھدار لڑکا تھا۔ اگر وہ کسی امیر کبیر گھرانے میں پیدا ہوا ہوتا تو اس عمر ہی میں کافی عزت اور شہرت حاصل کر چکا ہوتا۔ لیکن اب تو ایسا تھا جیسے ہیرا کوڑے کے ڈھیر میں دبا پڑا ہو۔ شاید پوری زندگی میں آج پہلا موقع آیا تھا کہ اسے غور کرنے اور کوئی مناسب فیصلہ کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی اور اس نے نہایت بہادری کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ خواہ کتنی بھی تکلیف اٹھانی پڑے چھوٹے قسطانی کو ضرور آزاد کرائے گا

اس قسم کی باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ دوبارہ جاگا تو صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر کی پر جلال آوازوں سے پورا شہر گونج رہا تھا۔ وہ کلمہ شریف پڑھتا ہوا اٹھا اور آہستہ آہستہ اذان کے مقدس جملے دہرانے لگا۔ یہ بات اسے توحید نے بتائی تھی کہ اذان ہو تو اس کے کلمے دہرانے چاہیں۔

اذان کے بعد کچھ دیر تو اسی طرح سناٹا رہا لیکن پھر آہستہ آہستہ سڑک پر آنا جانا شروع ہو گیا۔ نماز کے لیے مسجد میں جانے والوں کے بعد ڈبل روٹی اور مکھن فروخت کرنے والے "بن' ڈبل روٹی مکھن!" کی صدائیں لگاتے ہوئے گزرنے لگے۔ پھر گوالے دودھ کے برتن سروں پر رکھے آئے اور اس کے بعد دکانیں کھلنی شروع ہو گئیں۔ لیکن گلی کی ان دکانوں میں سے کسی پر بھی سائن بورڈ نہ تھا۔

کلو دکان کے تھڑے سے اتر کر گلی کے کونے پر آ کھڑا ہوا اور غنڈوں کے مکان کی طرف رخ کر کے یہ اندازہ کرنے لگا کہ یہ مکان کس رخ اور کہاں ہے۔

اسے یہاں آئے ہوئے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ اس مکان کا دروازہ کھلا اور وہ غنڈہ باہر نکلا جسے اس کے ساتھی استاد جی کہتے تھے اور اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ باہر نکلتے ہی سب سے پہلے اس کی نظر کلو پر پڑی۔

کلو کی تو جیسے جان نکل گئی۔ وہ ان غنڈوں کی نظروں سے بہر حال بچنا چاہتا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اگر وہ بھاگتا تو اس کے لیے اور خطرہ پیدا ہو جاتا۔ مجبوراً رک گیا۔

غنڈہ اس کے پاس آ کر ٹھہر گیا اور رعب دار آواز میں بولا "کون ہے بے تو! اور یہاں کیا کر رہا ہے؟"

کلو کچھ ایسا گھبرا گیا تھا کہ اس کی زبان سے بات نہ نکلتی تھی۔ لیکن قدرت نے اس وقت اس کی راہ نمائی کی اور بے سوچے سمجھے ہی اس نے اپنی زبان نکال کر اس پر انگلی رکھ دی۔

یہ اشارہ تھا "میں گونگا ہوں بول نہیں سکتا"۔

"ہونہہ گونگا ہے بد بخت!" غنڈے نے سوچنے کے انداز میں کہا۔ پھر اشارہ کیا "میرے ساتھ آ!" اور کلو چپ چاپ اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس وقت یہی بات اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھی۔ چھوٹے قسطانی کا حشر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

غنڈے نے ایک دکان سے ڈبل روٹیاں، مکھن اور انڈے خریدے اور یہ سب چیزیں کلو پر لاد کر اسے اپنے گھر لے آیا۔ اس کے ساتھیوں نے جو ایک اجنبی لڑکے کو اس کے ساتھ دیکھا تو قریب قریب سبھی نے سوال کیا "یہ کسے پکڑ لائے استاد جی؟"

"ہے ایک جانور، باہر سڑک پر کھڑا تھا۔ میرا خیال ہے اس مخلوق سے تعلق رکھتا ہے جسے لاوارث کہا جاتا ہے۔ میں نے خیال کیا اور نہیں تو تم لوگوں کی خدمت ہی کر دیا کرے گا" استاد نے اطمینان بھری آواز میں جواب دیا۔

"اور اگر یہ پولیس کا سدھایا ہوا نکلا؟" پھکڑ نے کلو کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو خود اس کا نقصان ہے۔ ہمارا اگر بہت نقصان ہوا تو پستول کی ایک گولی کا ہو گا۔ تم لوگوں کو فضول وہم میں نہیں پڑنا چاہیے!" استاد نے بے پروائی کے انداز میں کہا اور پھر کلو کی طرف دیکھ کر اشارے میں سمجھایا کہ یہ سارا سامان تو اس چارپائی پر رکھ دے اور جلدی سے جھاڑو دے ڈال، سارے کمروں میں"۔ پھر بولا "ہمارا خیال ہے جس دن سے مائی لاڈلی گئی ہے اس گھر کو یہ عزت نصیب نہیں ہوئی کہ اس میں جھاڑو دی جاتی۔ یہ بھی چھ چھ فٹ کے جوان ہیں مگر گھر کی صفائی کی توفیق کسی کو نصیب نہیں ہوتی"۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں استاد، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو تو دوسروں کے گھروں میں ہی جھاڑو پھیرنی خوب آتی ہے"

پھکڑ نے ہنستے ہوئے کہا اور اس کی اس بات پر استاد سمیت سب ہنس پڑے۔ جھاڑو دینے کا حکم سن کر کلو نے سیڑھیوں کے نیچے پڑی ہوئی جھاڑو اٹھا لی اور جلدی سے بڑے کمرے میں گھس گیا اور غنڈے ناشتے کی تیاری میں لگ گئے۔ وہ یوں خوش اور بے فکر نظر آ رہے تھے جیسے سارے شہر پر انہی کا راج ہو۔

ادھر کلو غریب خوف کی وجہ سے بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ ان غنڈوں کی خوفناک شکلیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر اس پر لرزہ ساطاری ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ چیخیں مار کر روئے لیکن ان ظالموں کے ڈر کی وجہ سے چپ تھا۔

کمرے میں آ کر تنہائی ملی تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے اور اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس وقت اس کا دل اسے اس بات پر سخت لعنت ملامت کر رہا تھا کہ اس نے ناحق اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا۔ اسے چاہیے تھا اس خطرناک جگہ سے بھاگ کھڑا ہوتا اور پھر پوچھتا پوچھتا اپنے گھر چلا جاتا۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی جلد ہی بزدلی کے ان خیالات پر اس کی فطری بہادری غالب آ گئی۔ اس نے کرتے کے دامن سے آنسو پونچھ ڈالے اور یہ ارادہ کر کے کام میں لگ گیا کہ چاہے جتنی تکلیف اٹھانی پڑے لیکن میں ان غنڈوں کو ضرور گرفتار کراؤں گا اور چھوٹے قسطانی کو ان کے چنگل سے نکالوں گا۔ (باقی آئندہ)

بلاعنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 اکتوبر 1998ء

ستمبر 1998ء کے بلاعنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل چھ عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ چھ ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

- عائشہ نظامی لاہور (مشعل بجے گی تو دہاڑی ملے گی۔ پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)
- فائزہ یسمی اسلام آباد (کچھ بھی ہو اولمپک آج ہی ہو گا۔ دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)
- محمد مجتبیٰ خان میرپور (نیا عالمی ریکارڈ۔ تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)
- یاسر شکیل قریشی سیال کوٹ چھاؤنی (پہلے برساتی اولمپکس۔ چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)
- عارف کفایت اللہ خان لطیف آباد (اولمپک کے دیوانے۔ پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)
- محمد ساجد انصاری ڈنگہ (ایسی دیوانگی دیکھی نہیں کہیں۔ چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)

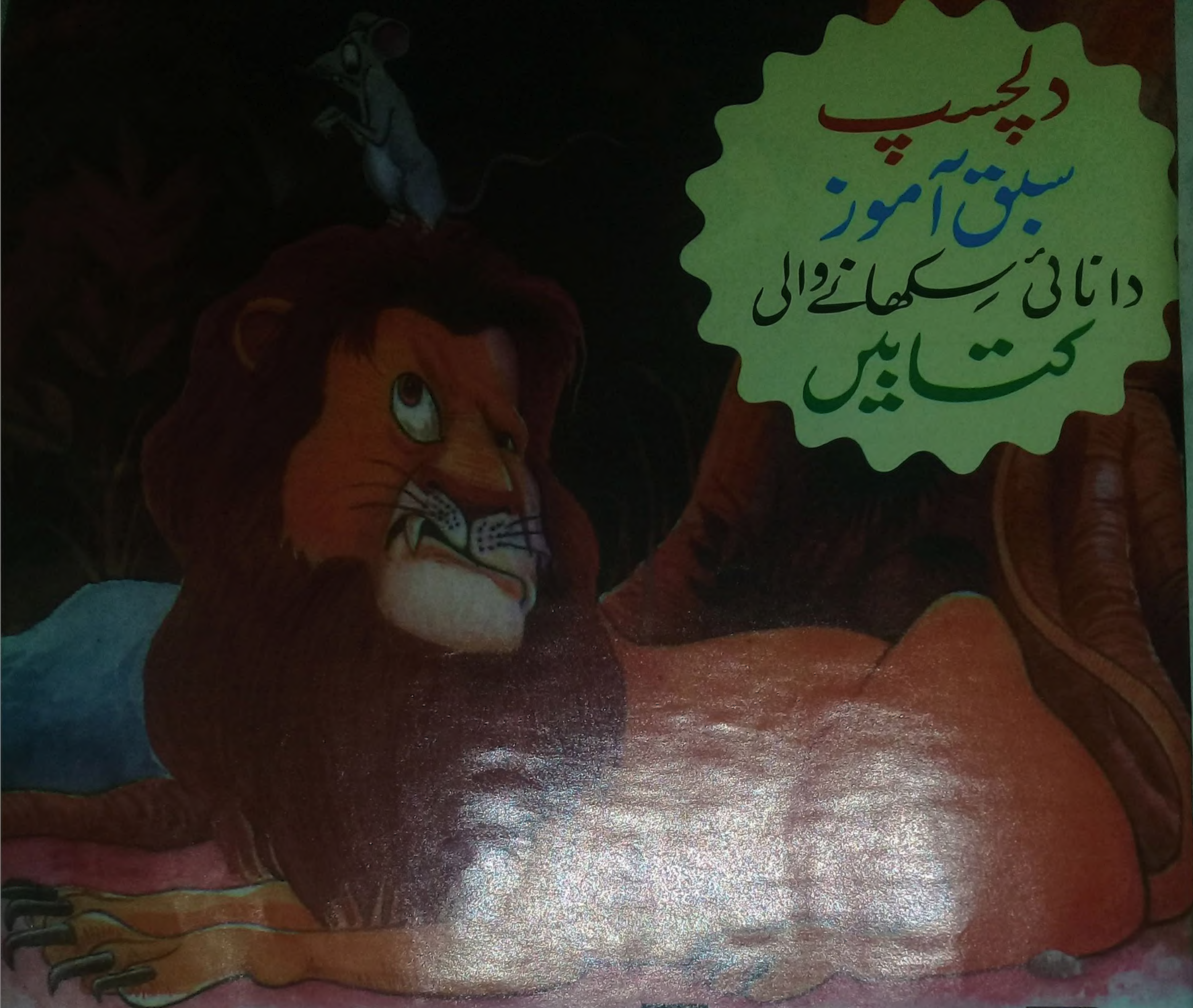

چھوٹا نام بڑا کام

عقلمند لڑکی

حاتم طائی کے کارنامے

آزاد بخت کی آپ بیتی

بھیڑیے کا گانا

دو درویشوں کا قصّہ

زخمی ہرن

چار سال کا بوڑھا

حاتم طائی کے قصے

کوہِ ندا

مزید دلچسپ کتابیں
دیکھنے کے لیے ہمارے
شورومز میں تشریف لائیں

فیروزسنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور راولپنڈی کراچی

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

NO. CPL 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

اپنے شہر کے
کُتب فروش سے طلب کیجیے

5 سال سے 8 سال تک کے بچّوں کے لیے

نہایت دِل چسپ اور مزیدار کہانیاں

آسان زبان ☀ جلی کتابت

ہر کہانی رنگین اور خوب صورت تصویروں سے سجی ہوئی!

سنڈریلا	ہنسل اور گریٹل	بی مانو کہاں چلیں؟
چندا رانی	لال ٹوپی والی	ایک بھیڑیا، سات میمنے
رمپل ڈمپل	چار دوست	واہ رے عقل مند

سفید گلاب، سُرخ گلاب

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور - راولپنڈی - کراچی